دوماہی برقی مجلہ

رشحاتِ قلم

شمارہ نمبر (۴) اپریل۔ مئی ۲۰۲۵ء

مطابق شوال۔ ذوالقعدہ ۱۴۴۶ھ

ناشر: ادارہ رشحاتِ قلم

کرتا رہوں گا جبر و تشدد پہ احتجاج | جب تک زباں میں طاقت عرض کلام ہے
لگتا رہے گا زخم جبین جمود پر | جب تک میرے قلم کی انی بے نیام ہے

فضا ابن فیضی

دوماہی برقی مجلہ

شمارہ:۴

"رشحات قلم" کے نام سے نشر ہونے والا یہ ایک برقی مجلہ ہے، جس کا اصل مقصد سیال قلمکار، منصف نامہ نگار، مصنف ومؤلف، محرر اور محقق پیدا کرنا ہے تاکہ ہم تحریری شکل میں دین کی خدمت انجام دے سکیں۔(ادارہ)

فہرست مضامین

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا اتفاق ضروری نہیں۔

ارباب قلم سے رشحاتِ قلم تک

اداریہ

معززقارئین!

آپ کے زیر مطالعہ جو یہ مجلہ ہے کوئی نیا نہیں ہے، ماقبل اس کے تین شمارے ضرور آپ کی نگاہوں سے گزرے ہونگے، بلکہ مطالعہ بھی کیا ہوگا، بس بعض مخلصین کے مشورے سے نام میں تھوڑی تبدیلی لائی گئی ہے، آپ کا پسندیدہ مجلہ "ارباب قلم" اب اپنے نئے نام اور نئی شناخت کے ساتھ "رشحات قلم" کے نام سے جانا اور پہچانا جائے گا، جسے آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے خوشی محسوس کر رہا ہوں، یہ تبدیلی صرف نام کی ہے مقصد، مشن اور آپ سے رشتہ ویسا ہی مضبوط اور قائم ہے جیسا پہلے تھا، نیا نام ہماری نئی سوچ، جدت اور بڑھتے ہوئے ورژن کی طرف ایک قدم ہے۔

جیسا کہ آپ بخوبی واقف ہیں کہ یہ مجلہ جامعہ نجران (سعودی عرب) میں زیر تعلیم طلباء و طالبات کا ترجمان ہے، یہاں کے طلباء و طالبات میں مختلف صلاحیتیں موجود ہیں، بس انہیں پلیٹ فارم مہیا کرانے کی ضرورت ہے، جب یہ محسوس ہوا کہ طلباء و طالبات کے اندر قلمی صلاحیتیں موجود ہیں لیکن مناسب پلٹ فارم نہ ہونے کی وجہ سے زنگ آلود ہو رہی ہیں تو گزشتہ سال "ارباب قلم" کے نام سے ایک میگزین نکالنے کا فیصلہ ہوا، اور تین شمارے شائع بھی ہوئے جو آج "رشحات قلم" نئے نام، نیا جوش اور بلند خواب کے ساتھ آپ کے سامنے ہے، ساتھ ہی ساتھ اس بات کا اعتراف کرتا چلوں کہ مجھ سمیت بعض نو آموز لکھاری بھی ہیں جن کی تحریر غلطیوں سے مبرا نہیں ہو سکتی اسی طرح بعض ایسے قلمکار کی تحریریں بھی شامل ہیں جن کی حوصلہ افزائی مقصود ہے تاکہ اس میدان میں مزید دلچسپی لے سکے نیز اردو، عربی کے علاوہ ہندوستان کی دیگر زندہ زبانوں میں لکھنے کی مکمل آزادی ہے۔ امید ہے کہ مندرجہ بالا نکات کی روشنی میں ہی اس مجلے کا معیار طے کریں گے۔

رشحات قلم "کی تیاری ایک مشترکہ سفر تھا، ایک ایسا سفر جو ہمارے پیارے اراکین کی محنت وقت اور خلوص و محبت سے مکمل ہوا۔

اس موقع پر ہم اللہ کے شکریہ کے بعد اپنے تمام اراکین، معاونین، مضمون نگاران اور قارین کا دل کی اتھاہ سے شکریہ ادا کرتے ہیں بالخصوص ہمارے سرپرست و نگراں شیخ شکیب الرحمن سنابلی صاحب اس شکریہ کے مستحق ہیں جن کی ایما پر یہ مجلہ منصہ شہود پر آیا اور اول دن سے اپنی سرپرستی کا حق ادا کیا، اسی طرح ہم معاون مدیران کا شکریہ ادا نہ کریں تو بڑی ہی نا انصافی ہوگی جنھوں نے ہر آن ہماری معاونت کر کے مشکل کام کو آسان بنایا اور بڑی ہی ناسپاسی ہوگی اگر اس موقع پر ہم برادرم جناب سعود صاحب کو بھول جائیں جو اول تا آخر دست و بازو بنے رہے۔

یہ الگ بات ہے کہ یہ چند شکریہ کے الفاظ ہمارے ان مخلصین کے خلوص واحسان کا متبادل نہیں ہوسکتے فللہ الحمد

اسی طرح ہم ان قلمکاروں سے معافی کے بھی خواستگار ہیں جن کے مضامین جمع تو ہوئے مگر کسی اداری مصلحت کے تحت شامل نہ ہو سکے۔

اللہ رب العالمین ہم سب کو اس کا اجر جزیل عطا فرمائے

اسد اللہ ابو طالب امواوی

طالب جامعہ نجران، سعودی عرب

مومنوں کی خوبیاں ازروئے قرآن کریم

عبدالقادر بن مطیع الرحمن سلفی

الحمد لله والصلاة والسلام على رسول الله، وبعد: فأعوذ بالله من الشيطان الرجيم

﴿ وَعِبَادُ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلَّذِينَ يَمۡشُونَ عَلَى ٱلۡأَرۡضِ هَوۡنٗا وَإِذَا خَاطَبَهُمُ ٱلۡجَٰهِلُونَ قَالُواْ سَلَٰمٗا ﴿٦٣﴾ ﴾ سورة الفرقان:٦٣.

ترجمہ: "رحمن کے (سچے) بندے وہ ہیں جو زمین پر فروتنی کے ساتھ چلتے ہیں اور جب بے علم لوگ ان سے باتیں کرنے لگتے ہیں تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ سلام ہے۔"

تفسیر:- ﴿عِبَادُ ٱلرَّحۡمَٰنِ﴾ یہ اضافت تخصیص وتشریف، ترجیح دینے اور قربت ظاہر کرنے کے لیے ہے، وگرنہ تمام مخلوقات اللہ کے بندے ہیں۔ اللہ کے (عباد) بندوں کی دو قسمیں ہیں: پہلی قسم عبودیت ربوبیت کی ہے، جس میں تمام مخلوقات شامل ہیں، چاہے وہ مسلمان ہوں یا کافر، نیک ہوں یا بدکار، کیوں کہ سب اللہ ہی کے بندے ہیں، جن کا وہ مدبر و مربی اور پالنہار ہے۔ فرمان ربانی ہے:﴿إِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ إِلَّا آتِي الرَّحْمَنِ عَبْدًا﴾ [مریم:٩٣] دوسری قسم عبودیت الوہیت، اطاعت وقبول نیز عبودیت رحمت خاصہ سے عبارت ہے، جو انبیاء ورسل، اولیاء اور صالحین کی عبودیت ہے، اور یہی یہاں مراد ہے۔ اسی لیے اسے (عباد) اللہ کے نام "الرحمن" سے منسلک کیا گیا ہے۔

"عباد" کا "الرحمن" (صیغۂ مبالغہ) کی طرف اضافت، ان کے لیے بطور بشارت وارد ہوئی ہے، نیز کفار مکہ پر بطور رد و تنکیر، کیونکہ وہ کہتے تھے " ﴿وَمَا ٱلرَّحۡمَٰنُ﴾ ۔ یہ اضافت اس بات کا بھی ایما ہے کہ محض اللہ کے لیے ان کا عبادت کرنا، ان پر اللہ کی رحمت کا بین مظہر ہے۔ مزید برآں وہ اس عبادت کے ذریعہ اپنے رب کی رحمت کی امید رکھتے ہیں، نہ کہ دنیا کے چیزوں کی، نہ ریا و نمود ان کا مقصد ہوتا ہے اور نا ہی اپنے بارے میں کسی مذمت کا دفاع، بلکہ وہ محض اللہ کی رحمت کے طلبگار ہیں۔

﴿يَمۡشُوۡنَ﴾ فعل مضارع ہے جو تجدد اور تکرار کا فائدہ دیتا ہے، یعنی وہ بار بار جب تب زمین پر چلتے ہیں، حقیقت ہے کہ لوگوں کو چلنے سے کہاں رست گاری ہے۔ ؟!

﴿عَلَى ٱلۡأَرۡضِ﴾ یہ ان کی حقیقت کی یاددہانی ہے اور ان کو اخلاقی بلندی کے لیے کوشش کرنے کی ترغیب بھی۔ مطلب وہ زمین پر چل رہے ہیں، کوئی ہوا میں اڑ نہیں رہے ہیں۔ لہذا تواضع وخاکساری لازمی برتیں۔

《هَوْنًا 》 اس سے مراد اللہ اور اس کے بندوں کیلیئے تواضع ، نرمی، سکون اور وقار کے ساتھ چلنا ہے۔ ترکیب نحوی میں یا تو یہ حال ہے یا صفت۔ مطلب : ہَیِّنِینَ. یا : مَشْیاً ہَیِّنًا۔ تاہم صفت قرار دینے سے مبالغہ کا فائدہ ملتا ہے۔

یہ نرمی اللہ کے لیے تواضع اختیار کرنے اور جاہلیت کے غرور کو مٹانے سے پیدا ہوتی ہے ، اس لیے ان کے چلنے کا انداز جاہلی لوگوں کی چال کے مخالف ہے ، جس سے ان کی رحم دلی کی بھی عکاسی ہوتی ہے ، کیونکہ رحم دلی اکڑ، کبر و غرور ، شوخی اور نخوت کے برعکس ہے۔

《يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا》 اس ٹکڑے کا ظاہری معنی تو قدرے واضح ہے کہ مومن اپنی چال میں نرم، متواضع، کبر و غرور سے پاک اور ریا و نمود والی حرکتوں سے پرے ہوتا ہے ، مزید غور کریں تو اس صفت حمیدہ کے کچھ لازمی معانی بھی طشت ازبام ہوتے ہیں۔ مثلا جب کہ وہ اپنی چال میں متواضع اور نرم ہوتے ہیں تو لازمی ہے کہ ان کی طبیعت میں نرم خوئی و نیک مزاجی، چشم پوشی و بردباری ، اور رحم دلی بھی ہوگی ، بنابریں لازم آتا ہے کہ وہ لوگوں کے ساتھ دینی و دنیاوی معاملات میں بھی انھیں ستودہ صفات سے مزین ہوں گے۔ یہی مومن کا طرۂ امتیاز ہے۔ مومن ہی تو ہوتے ہیں :-أَلِيفٌ (بے تکلف ، بے دھڑک ، بے اندیشہ) بَرٌّ (نیکوکار) بَشُوش (ہنس مکھ) حَلِيم (بردبار) رفیق (نرم خو) سَهْل (نرم مزاج) لیّن (لچک دار، منکسر المزاج) متواضع (خاکسار) متعاون (مددگار) هَيِّن (خوگر آسانی) وَرِع (پرہیزگار) وَقُور (باوقار) وغیرہ وغیرہ۔

لہذا مومن کی خوبیوں میں سے ایک خوبی ، چلنے میں نرمی ، تواضع اور خاکساری ہونی چاہیے۔ اسکے برعکس چال میں اکڑ، غرور، گھمنڈ اور خودپسندی، کی نحوست سے انہیں بچنا چاہیے۔ چناں چہ یہ مشہور آیت کریمہ زیر نگاہ رہے 《وَلَا تَمْشِ فِي ٱلْأَرْضِ مَرَحًاۖ إِنَّكَ لَن تَخْرِقَ ٱلْأَرْضَ وَلَن تَبْلُغَ ٱلْجِبَالَ طُولًا》 [الإسراء : ۳۷]

بنابریں پاؤں مار کر چلنا یا جوتوں سے آوازیں کرنا اگر دکھاوے اور تکبر کے ساتھ ہو تو وہ حرام ہے۔

یہ ملحوظ خاطر رہے کہ 《هَوْنًا》 سے مراد چلنے میں بوجھل پن اور سست روی نہیں ہے۔ کیونکہ نبئ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چال یہ تھی کہ: " إذا مشى تَكفَّأَ تكفُّؤًا كأنَّما انحطَّ من صبَبٍ "

أخرجه أحمد (٧٤٦) والترمذي (3637)، والحاكم (4194)، والبخاري في التاريخ الكبير (7/1)، وأبو زرعة الدمشقي في تاريخه : 159/1 واللفظ لهم. وصححه الألباني

"التَّكفُّؤ" کا معنی ذرا سامنے مائل ہو کر چلنا، "صبب" ڈھلان زمین کو کہتے ہیں، معنی یہ ہے رسول اکرم ﷺ ذرا خمیدہ ہو کر تیز روی سے چلتے تھے ، جیسے آدمی ڈھلان زمین سے اتر رہا ہو۔

﴿وَإِذَا خَاطَبَهُمُ ٱلْجَٰهِلُونَ ﴾ اس سے مراد جاہلانہ خطاب ہے جس میں بد اخلاقی، بے ادبی اور گستاخی شامل ہو۔ جیسا کہ فعل کا "الجاہلون" کی طرف اسناد کرنے سے ظاہر ہوتا ہے۔

"قالوا سلامًا" یہ سلام ان سے چشم پوشی، لڑائی یا تلخی سے بچنے، برائی کا جواب اچھائی سے دینے کے قبیل سے ہے، نہ کہ تکریمی یا تعریفی۔

آیت کریمہ کے اس جزء سے بندگان رب کعبہ کی ایک دوسری خوبی کا علم ہوتا ہے وہ ایں کہ وہ جاہل، بد زبان، بے ادب، ترش مزاج اور لاخیر لوگوں کے منہ نہیں لگتے، بلکہ چشم پوشی، تحمل، بردباری اور برے الفاظ کا جواب اچھے الفاظ سے دینے جیسے اعلی اقدار سے کام لیتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿خُذِ ٱلْعَفْوَ وَأْمُرْ بِٱلْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ ٱلْجَٰهِلِينَ﴾ [الأعراف: ۱۹۹]

﴿قَالُواْ سَلَٰمًا﴾ یہاں پر اللہ تعالی نے مومنوں کی اس اعلی خوبی کو سراہا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہالت اللہ کے یہاں قبیح و مبغوض شیئ ہے، اسی طرح کوئی اپنی طرف جہالت کی نسبت کو گوارا نہیں کرتا، بلکہ ہر کوئی اس سے براءت ظاہر کرنے کو محبوب جانتا ہے، یہ بھی علم کی برتری اور فوقیت کا بین ثبوت ہے۔

﴿وَإِذَا خَاطَبَهُمُ ٱلْجَٰهِلُونَ...﴾ اس خوبی کی توضیح میں اللہ تعالی نے "الذین" کے بجائے واوَ عاطفہ کو لایا ہے۔ جو اس بات کا بیانیہ ہے کہ جاہلوں کو "سلامًا" کہنا مومنوں کی نرمی اور رفق کی علامت ہے۔ یہی ان کا اخلاق ہے اور وہ اس سلام کو نہ صرف جاہلوں سے بچنے کے لیے استعمال کرتے ہیں، بلکہ اس سے ان کے رفق و تحمل کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

ماخوذ و مستفاد از تفسیر قنوجی، بقاعی، سعدی، ابن عثیمین، زمخشری، ابن عاشور، ابن بادیس، الدرر السنیۃ- تطبیق التفسیر المحرر، تفسیر سورۃ الفرقان -الآیات (55-62)

https://dorar.net/tafseer/25/12

لتحمیل التطبیق: https://dorar.net/article/2096

حج اور عمرہ کی فضیلت

درس حدیث

ثمامہ خاتون مطیع اللہ خان توحیدی

(طالبہ: کلیہ شریعہ، نجران یونیورسٹی)

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: العُمْرَةُ إلى العُمْرَةِ كَفَّارَةٌ لما بينهما، والحج المبرور ليس لَهُ جَزَاء إِلَّا الجَنَّةَ.

(صحیح بخاری: کتاب العمرة باب وجوب العمرة وفضلها، حدیث نمبر: 1773، صحیح مسلم: کتاب الحج، باب فی فضل الحج والعمرة ویوم عرفة. حدیث نمبر: 1349)

ترجمہ: ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایک عمرہ کے بعد دوسرا عمرہ دونوں کے درمیان کے گناہوں کا کفارہ ہے اور حج مبرور کا بدلہ جنت کے سوا کچھ نہیں ہے۔

فوائد و مسائل:

(1) یہ حدیث بار بار عمرہ کرنے کی فضیلت پر دلالت کرتی ہے کیونکہ اس میں پچھلے اور اگلے عمرہ کے درمیان ہونے والے گناہوں کی معافی کی بشارت دی گئی ہے۔

(2) اکثر اہل علم کے نزدیک سال میں ایک سے زائد عمرہ ادا کرنا درست ہے، جیسا کہ پیارے نبی ﷺ نے اس جانب ترغیب بھی دلائی ہے: تَابِعُوا بين الحج والعُمْرَةِ فَإِنَّهُمَا يَنْفِيَانِ الفَقْرَ وَالذُّنُوبَ كَمَا يَنْفِي الكِيرُ خَبَثَ الحَدِيدِ وَالذَّهَبِ وَالفِضَّةِ وَلَيسَ لِلحَجَّةِ المَبْرُورَةِ ثَوَابٌ إِلَّا الجَنَّة. (سنن ترمذي: أبواب الحج، باب ما جاء فی ثواب الحج والعمرة، وقال: حسن غریب، وقال الألبانی حسن صحیح فی صحیح سنن ابن ماجہ: 2878)

ترجمہ: حج و عمرہ کو پے درپے کرو کیونکہ یہ دونوں فقر اور گناہوں کو مٹا دیتے ہیں جیسے لوہار کی بھٹی سونے اور چاندی کے میل کو مٹا دیتی ہے اور حج مبرور کا صلہ سواء جنت کے کچھ بھی نہیں۔

(3) یہ حدیث اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ حج مبرور (حج مبرور وہ ہے جس میں نہ ریاکاری ہو، نہ شہرت طلبی، نہ فسق و فجور، اور نہ ہی کسی حرام مال سے کیا گیا ہو{التمهيد: 39/22}) کا بدلہ صرف جنت ہے۔

(4) حج مبرور کی پانچ صفات ہیں :

(أ) حج خالص اللہ کے لیے ہو، نہ کہ شہرت اور دنیاوی مفاد کے لیے۔

(ب) حج کے اخراجات حلال کمائی سے کیے جائیں۔

(ت) دوران حج ہر قسم کے گناہوں اور نافرمانیوں سے اجتناب کیا جائے، کیونکہ گناہ حج کے ثواب کو متاثر کرسکتا ہے۔

(ث) حج کے دوران اچھے اخلاق کا مظاہرہ کرنا چاہیے، اپنے رویے کو درست رکھنا چاہیے اور صبر و تحمل سے کام لینا چاہیے۔

(ج) شعائر اللہ اور مناسک حج کی تعظیم کرنی چاہیے، ان کے مقام اور عظمت کا خیال رکھنا چاہیے (تفصیل کے لیے دیکھیں : منحۃ العلام، د/عبداللہ صالح الفوزان، 5/159-161)

(5) حج کے کچھ شروط ہیں :

(1) پہلی شرط یہ ہے حج کرنے والا بالغ ہو، کیونکہ نابالغ پر حج واجب نہیں ہے اس لیے کہ وہ غیر مکلف ہے، لیکن اگر بلوغت سے پہلے وہ حج کرتا ہے تو اس کا حج صحیح ہوگا، مگر واجبی حج اس پر باقی رہے گا، لہذا جب وہ بالغ اور مستطیع ہو جائے تو اسے واجبی حج کرنا ہوگا۔

(2) دوسری شرط استطاعت ہے اور مستطیع وہ شخص ہے جو اس بات پر قادر ہو کہ اپنے مال اور بدن کے ذریعے حج کرسکتا ہو، اسی طرح عورت کے لیے ایک اضافی شرط یہ ہے کہ اس کے ساتھ اس کا محرم بھی حج میں ہو۔

(6) اگر کوئی انسان دائمی مریض ہو یا بوڑھا ہو تو وہ اپنی نیابت میں کسی سے حرج کرا سکتا ہے، لیکن اگر دائمی مریض نہ ہو تو وہ اپنی شفایابی کا انتظار کرے، جب شفایاب ہو جائے تو حج کرے، لیکن اگر اسی بیماری میں وہ وفات پا گیا ہے تو اسکے چھوڑے ہوئے مال سے حج کیا جائے گا اس کی جانب سے، (صفۃ الحج، علامہ ابن عثیمین رحمہ اللہ : ص : 21)

(7) جو انسان کسی کی نیابت میں حج کر رہا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنا واجبی حج پہلے ادا کر چکا ہو (أضواء البیان : 5/105)

(8) حج بدل کے لیے ایسے انسان کو چنا جائے جو احکام حج سے واقف ہو، متقی اور پرہیزگار ہو، امانت داری سے حج ادا کرے، مخلص ہو، جس کی جانب سے حج بدل کررہا ہے اسے حتی المقدور فائدہ پہنچانے کی تڑپ ہو، اور حج کے ارکان وواجبات کو بہترین انداز سے ادا کرنے والا ہو۔

اخیر میں اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعاء ہے کہ اے بار الہ! تو ہم تمام کو حج وعمرہ کی سعادت بار بار نصیب فرما اور ان اہم شعائر کو اسی طرح ادا کرنے کی توفیق عطا فرما جس طرح شریعت میں مطلوب ہے۔ آمین

سجدۂ سہو: چند اہم احکام ومسائل

شکیب الرحمن عبدالکریم خان سنابلی

(طالب: کلیہ شریعہ واصول الدین)

نماز اسلام کا دوسرا اہم رکن ہے اور ہر عاقل وبالغ مسلمان پر روزانہ پانچ مرتبہ فرض کی گئی ہے، مگر افسوس کہ دین سے غفلت اور لاپرواہی کی بنا پر آج نماز جیسی روزانہ پانچ مرتبہ ادا کی جانے والی اہم عبادت کے مسائل سے بھی لوگ پوری طرح واقف نہیں ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم لوگ نماز کے تمام مسائل کو جانیں اور عملی تطبیق بھی انہیں دیں، تاکہ ہماری نماز اسی طرح ادا ہو سکے جس طرح پیارے حبیب ﷺ نے ادا کرنے کا حکم دیا ہے تاکہ مکمل ثواب بھی حاصل ہو سکے

نماز کے جہاں بہت سارے مسائل ہیں وہیں پر ایک اہم مسئلہ جسے **سجدۂ سہو** کہا جاتا ہے، اس میں تو بہت سے لوگ غلطی کر بیٹھتے ہیں، لہذا اسی وجہ سے اس مختصر موضوع میں **سجدۂ سہو** کے چند ضروری احکام ومسائل بیان کیے جائیں گے تاکہ اس اہم مسئلہ سے آگہی ہو اور غلطی وخطا محفوظ رہیں۔

سجدۂ سہو کی تعریف:

نماز میں (سجدۂ سہو) نمازی کو کسی سہو کی وجہ سے آنے والے خلل (کمی، زیادتی اور شک) کی بھرپائی کرنے کے لیے جو دو سجدے کیے جاتے ہیں انہیں **سجود السھو** کہتے ہیں۔ (مجموع فتاوی ورسائل العثیمین: 94/14)

سجدۂ سہو کا حکم:

اہل علم کا اجماع ہے کہ سجدۂ سہو نماز میں مشروع ہے۔ (حاشیۃ الروض المربع: 137,138/1)

جمہور اہل علم اسے واجب کہتے ہیں۔ (المغنی: 433/1)

جس آدمی سے نماز میں سہو ہو گیا اور جان بوجھ کر اس نے سجدۂ سہو نہیں کیا تو اسکی نماز باطل ہو جائے گی، چاہے یہ سجدۂ سہو سلام پھیرنے سے پہلے ہو یا بعد میں۔ (مجموع الفتاوی لابن تیمیۃ: 3334/23)

سجدۂ سہو کی حکمت:

(1) اللہ کی رضامندی اور اسکے حکم کی پیروی کرنا۔

(2) نماز میں جو خلل اور کمی ہو گئی تھی اسے پورا کر کے اللہ کا تقرب حاصل کرنا۔

(3) شیطان کو ذلیل و رسوا کرنا۔ (تفصیل کے لیے دیکھیں، شرح صحیح مسلم للنووي : 65/5، 60، إكمال المعلم : 510,511/2)

سجدۂ سہو کے اسباب :

(1) بھول کر نماز میں زیادتی کر دینا۔

(2) بھول کر نماز میں کمی کر دینا۔

(3) شک کی بنیاد پر۔

"جان بوجھ کر اگر کوئی انسان نماز میں زیادتی یا کمی کرتا ہے تو اسکی نماز باطل ہو جائے گی"، (کشاف القناع : 465/2)

سجدۂ سہو کے چند اہم احکام و مسائل :

(1) اگر کوئی آدمی نماز کے واجبات میں سے کسی واجب (یہاں واجب سے مراد واجب فعلی ہے) کی زیادتی کرتا ہے جیسے کسی رکعت میں رکوع، سجدہ، یا قیام و قعود کی زیادتی کرتا ہے تو اسکے اوپر واجب ہے کہ وہ اس زیادتی کی وجہ سے سجدۂ سہو کرے، (المجموع شرح المهذب، 127/4)، اور پیارے نبی ﷺ نے فرمایا : **إذا زاد الرجل أو نقص فليسجد سجدتين**، (صحيح مسلم : 572)

(2) اس بات پر اجماع ہے کہ اگر کوئی انسان فرض نماز میں سہوا زائد رکعت کے لیے کھڑا ہو گیا (جیسے چار رکعت والی نماز میں چار رکعت پڑھنے کے بعد پانچویں رکعت کے لیے کھڑا ہو جائے) تو اس کے اوپر واجب ہے کہ جس حال میں ہے اسی حال میں بیٹھ جائے، (المجموع : 163/4)، اس لیے کہ اگر وہ نہیں بیٹھا تو گویا کہ وہ نماز میں جان بوجھ کر زیادتی کر رہا ہے جس سے اس کی نماز باطل ہو جائے گی۔

(3) اگر کوئی انسان سفر میں ہے مگر قصر کی نیت نہیں کیا ہے، اور چار رکعت والی نماز میں دو رکعت پڑھ کر تیسری رکعت کے لیے سہوا کھڑا ہو گیا، لیکن اگر وہ اتمام نماز کی نیت کر لیتا ہے اور مکمل چار رکعات پڑھ لیتا ہے تو اس کے اوپر سجدۂ سہو نہیں ہے، کیونکہ وہ اصل کی طرف لوٹ گیا ہے، (شرح المنتهى : 453/1)

(4) اگر کوئی انسان دن یا رات میں نفل نماز پڑھ رہا ہے اور اس میں وہ دو رکعت کے بعد تیسری رکعت کے لیے کھڑا ہو گیا تو اس کے اوپر لازم ہے کہ رجوع کرے یعنی سلام پھیرنے کے لیے بیٹھ جائے اور سجدۂ سہو بھی کرے، اس لیے کہ نماز وتر کے علاوہ کسی بھی نماز کو وتر کی طرح نہیں پڑھنی ہے۔ (التمھید: 255,251/4) اور اس لیے بھی کہ نفل نماز رات یا دن میں کسی بھی وقت ایک سلام کے ساتھ دو رکعت سے زیادہ پڑھنا درست اور جائز نہیں ہے، جیسا کہ صحیح بخاری (472) اور صحیح مسلم (749) میں ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں پیارے نبی ﷺ کا اسوہ اس تعلق سے موجود ہے۔

(5) اگر کوئی انسان جان بوجھ کر نماز میں ایسا کوئی کام کرتا ہے جس کا تعلق نماز سے نہیں ہے، بغیر کسی شدید حاجت کے اور برابر یہ کرتا رہتا ہے تو اسکی نماز باطل ہو جائے گی، (الشرح الکبیر والإنصاف: 614/3، 18,19/4) اس لیے کہ یہ حرکت نماز کے منافی ہے اور نماز کی ہیئت اس سے تبدیل ہو جاتی ہے۔

(6) اگر کوئی انسان نماز میں تھوڑی حرکت کرتا ہے، اور یہ حرکت نماز میں کسی مامور بہ حکم کی وجہ سے ہو جیسے صف میں موجود خالی جگہ کو پر کرنا ہو، یا بچھو یا سانپ کو مارنا یا نمازی کے آگے سے کوئی گزر رہا ہے تو اسے روکنا ہو وغیرہ تو اس سے نماز باطل نہیں ہوگی، کیونکہ اس کا حکم دیا گیا ہے گرچہ حرکت زیادہ کر دیا ہو (المغنی، باب الإمامۃ: 94,95/3)

(7) اگر کوئی انسان نماز میں اپنی نگاہ کو آسمان کی طرف جان بوجھ کر اٹھاتا ہے اس حال میں کہ وہ جانتا ہے کہ یہ عمل نماز میں منع ہے تو اسکی نماز باطل ہو جائے گی، (الشرح الممتع: 226,228/3)، لیکن اگر کوئی سہوا یا جہالت کی بنیاد پر نگاہ کو آسمان کی جانب اٹھا دیتا ہے تو اسکی نماز باطل نہیں ہوگی اور نہ سجدۂ سہو اس پر کرنا ہے کیونکہ نہ جاننے کی وجہ سے اسے اس معاملے میں معذور سمجھا جائے گا،

(8) اگر کوئی انسان بھول کر نماز میں بات کر لیتا ہے حالانکہ اسے نماز میں بات کرنے کی حرمت کا علم نہیں ہے تو اسکی نماز درست ہوگی اور سجدۂ سہو بھی اس پر نہیں ہوگا، (تفصیل کے لیے دیکھیں مجموع الفتاوی لابن تیمیۃ: 366/20)

(9) اگر کوئی انسان نماز کا کوئی رکن بھول جاتا ہے پھر دوسری رکعت شروع ہونے سے پہلے اسے یاد آجاتا ہے کہ فلاں رکن اس سے چھوٹ گیا ہے تو اس کے اوپر واجب ہے کہ وہ پہلے جو چھوٹ گیا ہے اسے پورا کرے بعد میں بقیہ نماز مکمل کرے، (الإنصاف: 49/4) و(شرح صحیح البخاري لابن بطال 213/3) اور آخر میں سجدۂ سہو بھی کرے گا۔

(10) اگر کوئی انسان نماز میں کسی واجب کو بھول جاتا ہے جیسے تشہد اول، یا تکبیرات انتقال میں سے کوئی تکبیر اور اس کا محل بھی چلا جاتا ہے تو اس کے اوپر واجب ہے کہ اس کمی کی بھرپائی سجدۂ سہو سے کرے۔ (صحیح البخاري: 829، صحیح مسلم: 570)

(11) اگر کوئی انسان دو رکعت کے بعد تشہد میں بیٹھنے کی جگہ تیسری رکعت کے لیے کھڑا ہونے لگتا ہے کہ اس اسے یاد آجاتا ہے کہ تشہد اس سے چھوٹ گیا، تو اسے چاہیے کہ وہ تشہد کے لیے لوٹ جائے اور نماز مکمل کرے، (الاِنصاف :58/4) زیاد بن علاقہ سے مروی ہے کہ وہ کہتے ہیں ایک مرتبہ ہمیں مغیرہ نے نماز پڑھائی مگر دو رکعت پڑھنے کے بعد وہ تشہد میں بیٹھنے سے پہلے کھڑے ہو گیے، مقتدی انہیں تسبیح کے ذریعہ تنبیہ کیے مگر انہوں نے اشارہ کیا کہ آپ لوگ کھڑے ہو جائیں، اس کے بعد جب وہ نماز سے فارغ ہوئے، سلام پھیرا سجدۂ سہو کیے اسکے بعد پھر سلام پھیرا، اور گویا ہوئے کہ اسی طرح پیارے نبی ﷺ نے کیا ہے۔ (مسند احمد : 18163، حسن لغیرہ، ابن ابی شیبہ :4535، صحیح) حدیث کے ظاہر سے یہی پتہ چلتا ہے کہ جبے دو رکعت پڑھنے کے بعد تشہد میں بیٹھنے سے پہلے مکمل قیام کے لیے کھڑا ہونے سے پہلے پہلے یاد آگیا کہ اس نے تشہد چھوڑ دیا ہے تو اسے تشہد میں بیٹھ جانا چاہیے اور اس کے اوپر سجدۂ سہو بھی واجب نہیں ہوگا کیونکہ اس سے مکمل سہو نہیں ہوا ہے جو سجدۂ سہو کو واجب کر دے۔ (مصنف عبد الرزاق : 3486، صحیح) اس مسئلہ میں دوسرا قول یہ ہے کہ سجدۂ سہو کرے گا جیسا کہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے کیا ہے۔ (مصنف عبدالرزاق : 3489، صحیح) لیکن اگر مکمل کھڑا ہو گیا ہے تیسری رکعت کے لیے تو بقیہ نماز مکمل کرے گا اور آخر میں سجدۂ سہو اس پر واجب ہوگا۔ (المجموع : 123/4، الشرح الکبیر : 59/4)

(12) اگر کوئی انسان چار رکعت والی نماز یا مغرب کی نماز میں دو ہی رکعت پر سلام پھیر دے یا چار رکعت والی نماز میں دو رکعت پر سلام پھیر دے یا وتر کے علاوہ دو رکعت والی نماز میں ایک ہی رکعت میں سلام پھیر دے اس گمان میں کہ اسکی نماز مکمل ہوگئی ہے، پھر اسے فورا یاد آجائے زیادہ طویل فصل نہ ہوا ہو، نہ ہی کسی سے بات کیا ہو، نہ ہی اس کا وضوء ٹوٹا ہو اور نہ دوسری کسی نماز کو پڑھنا شروع کیا ہو تو اس کی نماز باطل نہیں ہوگی اس کے لیے واجب ہے بقیہ نمازیں مکمل کرے اور آخر میں سجدہ سہو بھی کرے، (المغنی :403/2) اسی طرح اگر بات بھی کر لیا ہو، یا کسی دوسری نماز کو بھی پڑھنا شروع کر دیا ہو اور لمبا فاصلہ بھی ہو گیا ہو اس کے بعد اسے یاد آیا کہ اس نے ایک رکعت یا دو رکعت چھوڑ دی ہے تو اقرب یہی ہے کہ اس کی نماز باطل نہیں ہوگی، (المفہم :190/2، مزید تفصیل کے لیے دیکھیں المغنی باب ما یبطل الصلاۃ :383/2) بلکہ اسے یاد آنے یا یاد دلانے کے بعد بقیہ رکعتیں مکمل کرنا چاہیے اور آخر میں سجدۂ سہو بھی کرنی چاہیے، جیسا کہ عمران بن حصین رضی اللہ عنہ (صحیح مسلم : 574) اور معاویہ بن خدیج رضی اللہ عنہ (ابو داؤد :1023، صحیح) کی مروی احادیث میں تفصیل موجود ہے۔

(13) اسی طرح سنت قولیہ اور فعلیہ کے ترک کرنے کی وجہ سے بھی سجدۂ سہو مستحب نہیں ہے (تفصیل کے لیے دیکھیں المجموع :122,128/4، الشرح الممتع :340/339/3، مواہب الجلیل :287/2، بدایۃ المجتہد :102,103/4)

(14) اگر کسی کو دوران نماز یہ شک ہوگیا کہ اسنے کوئی رکن چھوڑ دیا ہے یا تعداد رکعات میں کمی کردی ہے مگر یہ شک کسی بھی احتمال کی طرف راجح نہ ہو تو اسے چاہیے کہ کم والے رجحان کو بنیاد بنا کر بقیہ رکعات کو مکمل کرے (شرح مسلم للنووي : 63/5) پھر آخر میں سلام پھیرنے سے پہلے سجدۂ سہو کرے (صحیح مسلم : 571)، لیکن اگر دونوں احتمال (زیادتی یا کمی) میں سے جو راجح ہو اسی پر یقین کرتے ہوئے بقیہ رکعتیں مکمل کرے پھر سجدۂ سہو کرے، (الأوسط لابن المنذر : 474،475/3)

(15) اگر کسی کو نماز کے بعد شک پیدا ہو کہ اس نے کوئی رکعت یا رکن چھوڑ دی ہے تو اس کے اوپر رجوع اور سجدۂ سہو دونوں واجب نہیں ہے اسلیے کہ ظاہر یہی ہے کہ اس نے مکمل نماز ادا کی ہے، اور اس شک کا اس کی نماز پر کوئی اثر نہیں پڑے گا کیونکہ یہ شک عبادت انجام دینے کے بعد طاری ہوا ہے، (المھذب مع المجموع : 115,116/4)

سجدۂ سہو کب کیا جائے؟

اس مسئلے میں سب سے قریب تر بات یہ ہے کہ اگر سہو نماز میں کمی کی بنیاد پر ہو تو سلام پھیرنے سے پہلے سجدۂ سہو کیا جائے گا، اگر زیادتی کی بنیاد پر ہو تو سلام پھیرنے کے بعد سجدۂ سہو کیا جائے گا، اگر شک کی وجہ سے ہو اور راجح یقین پر ہو تو سلام پھیرنے سے پہلے سجدۂ سہو کیا جائے گا اور اگر غالب گمان پر بنیاد ہو تو سلام پھیرنے کے بعد سجدۂ سہو کیا جائے گا، اسی پر سجدۂ سہو کے تعلق سے وارد حدیثین دلالت کرتی ہیں، (مزید تفصیل کے لیے دیکھیں مجموع الفتاوی لابن تیمیۃ : 24،25/23، اختیارات ابن تیمیۃ الفقھیۃ د/عایض الحارثي : 542,558/2)

سجدۂ سہو کی تعداد کتنی ہے؟

سجدۂ سہو کی تعداد دو ہے یعنی دو سجدے کیے جائیں گے، چاہے ایک سے زائد سہو ہو جائے، یا ایک سے زائد جنس ہی میں ہو جائے، یا گرچہ مواضع سجدۂ سہو (سلام پھیرنے سے پہلے یا بعد) میں اختلاف ہی کیوں نہ ہو، (مزید تفصیل کے لیے دیکھیں مواہب الجلیل : 16/2، بخاری : 401، مسلم : 572، الأوسط : 512/3، مختصر اختلاف العلماء : 278/1، المجموع : 140/4، شرح مسلم للنووي : 57/5)

کیا سجدۂ سہو کے لیے طہارت اور استقبال قبلہ شرط ہے؟

جی ہاں، سجدۂ سہو کے لیے طہارت اور استقبال قبلہ شرط ہے کیونکہ یہ نماز ہی کا ایک حصہ ہے، (تفصیل کے لیے دیکھیں فتح الباري لابن رجب 314/2، البحر الرائق : 396/1، المحیط البرہانی : 183/1)

کیا سجدۂ سہو کے تکبیر کہنا واجب ہے؟

سجدۂ سہو نماز ہی کے سجدے ہیں، اس میں وہی چیز واجب ہوگی جو نماز میں واجب ہے، لہذا ان دونوں سجدوں میں جاتے اور اٹھتے وقت تکبیر واجب ہے، (تفصیل کے لیے دیکھیں إكمال المعلم 513/2، شرح مسلم للنووي :5/ 59، عمدة القاري :75/12، فتاوى اللجنة الدائمة :126,127/2) البتہ جمہور اہل علم کے نزدیک سلام پھیرنے کے بعد والے سجدۂ سہو میں تکبیرۂ احرام مشروع نہیں ہے، سنت میں وارد نہ ہونے کی وجہ سے، (فتح الباري لابن حجر العسقلاني : 99/3)

سجدۂ سہو کی ہیئت کیسی ہو؟

سجدۂ سہو نماز کے سجدوں کی طرح کیا جائے گا جیسے دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھنا، تورک کرنا دونوں سجدوں کے بعد وغیرہ، (تفصیل کے لیے دیکھیں المجموع :161/4، روضة الطالبين : 315/1)

سجدۂ سہو میں کونسا ذکر مشروع ہے ؟

سجدۂ سہو میں وہی اذکار اور دعائیں پڑھی جائیں گی جو نماز کے سجدے میں پڑھی جاتی ہیں، (فتاوی اللجنة الدائمة :149/7)

کیا سجدۂ سہو کے بعد تشہد ہے ؟

سجدۂ سہو اگر سلام پھیرنے سے پہلے ہو یا بعد میں دونوں حالتوں میں تشہد مشروع نہیں ہے، پیارے نبی ﷺ سے ثابت نہ ہونے کی بنیاد پر، (مزید تفصیل کے لیے دیکھیں صحیح البخاري : 829، صحیح مسلم : 570، فتح الباري لابن رجب :477/6، الحاوي الكبير للماوردي :231/2)

کیا سجدۂ سہو کے بعد سلام پھیرنا پڑے گا؟

نمازی پر واجب ہے کہ سجدۂ سہو سلام پھیرنے سے پہلے ہو یا بعد میں دونوں حالتوں میں سلام پھیرے، اگر سلام پھیرنے سے پہلے سجدۂ سہو کیا جائے تو نماز میں جو سلام پھیری جاتی ہے وہی کافی ہوگی البتہ سلام پھیرنے کے بعد اگر سجدۂ سہو کیا جائے گا تو مزید ایک سلام پھیرا جائے گا جیسا کہ ذی الیدین والی حدیث میں اس کا تذکرہ موجود ہے، (صحیح البخاري :482، صحیح مسلم :573)

امام کو مقتدی کیسے تنبیہ کریں سہو ہونے کی صورت میں؟

اگر امام سے نماز میں سہو ہو جائے تو مرد حضرات تسبیح یعنی **سبحان اللہ** کہ کر امام کو متنبہ کریں گے اور خواتین تصفیق کے ذریعے، (تالی بجا کر، ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ کے اوپر رکھ کر مارنا)، (صحیح البخاري :7190،1203، صحیح مسلم :421،422)

امام کو جب تنبیہ کیا جائے سہو پر تو امام کو کیا کرنا چاہیے؟

جب امام متنبہ کیا جائے سہو پر، مگر امام کو اس بات کا یقین ہو کہ اس سے سہو نہیں ہوئی ہے تو اس کے لیے درست نہیں ہے کہ وہ مقتدی کی متابعت کرے، تاکہ کہیں اس چیز کی متابعت نہ ہوجائے جس کے بارے میں اسے علم ہے کہ یہ غلط ہے، (المغنی: 415/2) البتہ اگر اسے یقین نہ ہو کہ اس سے سہو نہیں ہوئی ہے تو مقتدی کی بات پر رجوع کرے، جیسا کہ پیارے نبی ﷺ نے ذی الیدین کی تنبیہ پر رجوع کیا تھا،

اخیر میں اللہ جل شانہ سے دعاء ہے کہ اے بار الہٰ: تو ہمیں اپنی نمازوں کو درست کرنے اور جس طرح پیارے رسول ﷺ نے پڑھنے کے لیے کہا ہے اسی طرح پڑھنے اور اس مداومت برتنے کی توفیق عطا فرما، آمین یارب العالمین

هذا ما عندي

والله تعالى أعلم بالصواب،

وصلى الله على نبينا محمد صلى الله عليه وسلم

طلباء کے لئے تین اہم کام

وہ احباب جن کا علم سے تعلق ہے انھیں فرائض وواجبات کی ادائیگی کے علاوہ یومیہ تین کام ضرور کرنے چاہیئے:

۱- کچھ نہ کچھ یومیہ منظم انداز میں پڑھنا۔

۲- کچھ نہ کچھ یومیہ منظم انداز میں لکھنا۔

۳- کچھ نہ کچھ یومیہ منظم انداز میں حفظ کرنا۔

آپ روزآنہ چند صفحات ہی پڑھیں، چند جملے ہی لکھیں، چند سطریں ہی حفظ کریں، مگر کریں ضرور!

یقین کریں آپ کی علمی وفکری زندگی کی تعمیر وترقی کے لئے یہ بہت ہی نفع بخش اور ضروری ہیں۔

ان شاءاللہ چند مہینوں میں اس کی برکت سے آپ کا وجود لہلہا اٹھے گا۔

د/وسیم المحمدي

باپ ایک عظیم ہستی

فرحان احمد عبدالرب

ہمارے معاشرے میں ماں کا مقام و مرتبہ تو ہر لحاظ سے اجاگر کیا جاتا ہے معاشرے کا کوئی فرد ایسا نہیں جو ماں کی قربانیوں اور بچوں کے لیے اس کے جزبہ فدائی کا قائل نا ہو ہر شخص ماں کی عظمت و شان اور مقام و مرتبہ کا ذکر کرتا دکھائی دیتا ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو محض گوشت کا ایک متحرک لوتھڑا ہوتا ہے زندگی اور نمو کی جتنی قوتیں بھی رکھتا ہے سب کی سب پرورش و تربیت کی محتاج ہوتی ہیں یہ پرورش محبت و شفقت، حفاظت و نگہداشت اور بخشش و اعانت کا ایک طویل سلسلہ ہوتا ہوتا ہے اور اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک بچہ اپنے جسم و ذہن کے حد بلوغ تک نہیں پہنچ جاتا ماں پیدائش کے دن سے لیکر بلوغ تک بچے کو پالتی، بچاتی، سنبھالتی اور ہر حالت میں اس کی ضروریات پرورش کا سامان مہیا کرتی ہے۔ بچہ آنکھ کھولنے سے لیکر بالغ ہونے تک اپنے ارد گرد ماں کو ہی پاتا ہے وہ دیکھتا ہے کہ کیسے اسکی ماں اسکا خیال رکھ رہی ہے کیسے اسکی ضرورتوں کو پورا کر رہی ہے غرض کہ اس وقت بچے کی پوری کائنات اس کی ماں ہی ہوتی ہے وہ سب کچھ اپنی ماں کو ہی سمجھتا ہے۔

ماں کا بہت بڑا اور خاص مقام ہے اور یہ حقیقت اپنی جگہ باقی اور مسلم ہے لیکن کہیں نا کہیں باپ کا مقام کسی حد تک نظر انداز کر دیا جاتا ہے بلکہ باپ کی قربانیوں کا تذکرہ کرنے والے خال خال ہی نظر آتے ہیں جبکہ بچے کی ولادت کے وقت جس قدر ماں قربانیاں دیتی ہے اسی قدر باپ ولادت سے لیکر سن بلوغت تک آنے والے اخراجات کا بھاری بھرکم بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھاتا ہے۔ بیماریوں نے گھیرا تو اس کے علاج و دوا اور تندرستی کے لیے جہاں ماں تڑپتی ہے وہیں باپ اچھے سے اچھے اسپتال اور ڈاکٹر سے بغرض علاج پیسوں کا انتظام کرتا ہے علاج و معالجہ میں خرچ ہونے والی رقم کا بوجھ اپنے سینے پر برداشت کرتا ہے لیکن بچوں کو یہ احساس نہیں ہو پاتا کیوں کہ وہ انکی نظروں سے دور گھر سے باہر گھر کا چولہا جلتا رہے اس کے لیے کڑی محنت کرتا ہے زندگی کے تپتے صحرا نفسا نفسی کے دور میں باپ ہی وہ عظیم ہستی ہے جو ماں کے بعد اولاد کی معمولی سی تکلیف پر پریشان و مضطرب ہو جاتا ہے اک باپ اپنی اولاد ہی کی خاطر انکی خوشیوں اور سکون کے لیے اپنی زندگی وقف کر دیتا ہے باپ کا رشتہ محبت، قربانی، اور ذمہ داری کا حسین امتزاج ہوتا ہے۔

باپ وہ ہستی ہے جس کا سایہ دنیا کے تمام سایوں سے زیادہ ٹھنڈک اور چھاؤنی کا احساس دلاتا ہے ایسا سایہ جو اپنی اولاد کو دھوپ اور مشکلات کی گرماہٹ سے محفوظ رکھتا ہے باپ اگرچہ اپنی بزرگی کی عمر کو پہنچ جائے پھر بھی اولاد کے لیے اک مضبوط دیوار کے مانند ہوتا ہے کہ بچوں پر آنے والی تمام پریشانیوں اور مصیبتوں سے لڑنے اور انہیں جھیلنے کے لیے ہمیشہ آگے کھڑا رہتا ہے بلکہ اگر اک مضبوط قلعہ کہا جائے تو زیادہ موزوں ہوگا جس کے اندر اولاد خود کو محفوظ سمجھتی ہے۔

اولاد کی پیدائش اور طفولیت سے ہی اس کے درخشاں اور متجلی مستقبل کے لیے اپنی جوانی کے دنوں کو قربانیوں کی بھینٹ چڑھانا شروع کر دیتا ہے اپنے خوابوں اور چاہتوں کا تاج محل کو زمیں بوس کرنے پر اک لمحہ بھی ضائع نہیں کرتا اپنے جذبات کو کچل کر اپنا اک اک لمحہ اور گھڑی اپنی اولاد کے لیے جینا شروع کر دیتا ہے۔

والد کی محبت اولاد کے لئے ہمیشہ بے لوث ہوتی ہے اپنا سارا سکون و اطمینان اپنی ریاضت اور محبت سمیت اپنی پوری زندگی اپنے بچوں کی مسکراہٹ اور انکی خوشیوں سے جوڑ لیتا ہے۔

اپنی ترجیحات، آرزووں اور تمناؤں کو سینے میں دفن کر کے جوانی کے خوبصورت اور دلکش اوقات و ایام خرچ کر کے اولاد کی خوشی خریدنے کے لیے گھر سے نکل پڑتا ہے تاکہ انکے خوابوں کو پورا کر سکے انکی ترقی اور ترویج ہو سکے ان کی تعلیم و تربیت بہترین ہو سکے انکے درخشندہ اور تابندہ مستقبل کے لیے خود کو دھوپ میں جلاتا ہے۔

جہاں ماں بچے کو نو مہینہ تک اپنے پیٹ میں رکھ کر تکالیف کے متعدد مراحل سے گزرتی ہے وہیں اک باپ بچوں کی ہی خاطر موسم گرما کی جسم و جاں کو جھلسا دینے والی دھوپ کی شدت برداشت کرتا ہے تاکہ اسکی اولاد کو ٹھنڈک اور اچھی زندگی میسر ہو جہاں اک ماں بچے کی محبت میں یخ بستہ اور منجمد رات میں اپنے بچے کو سوکھے بستر پر لٹا کر خود گیلے بستر پر لیٹنا پسند کرتی ہے وہیں اک باپ موسم سرما کی ہڈیوں کے اندر سرایت کر جانے والی سرد اور مسموم ہواہوں کو جھیلتا ہے تاکہ اسکی اولاد زمانے کی مسموم ہواہوں اور اثرات سے محفوظ رہے جہاں اک ماں اپنی بھوک و پیاس مار کر اپنے حصے کا آخری نوالہ بھی اپنے بچے کے منہ میں ڈال دیتی ہے وہیں اک باپ اپنے سکون و آرام کو مار کر اولاد کو سکون و ثبات فراہم کرنے کے لیے دن و رات محنت و مشقت اور جدوجہد کرتا نظر آتا ہے۔

ماں کے ساتھ ساتھ باپ کا اپنے بچوں کی پرورش میں ایک خاص کردار ہوتا ہے اگرچہ ماں نرم مزاج ہوتی ہے، لیکن باپ جسے ماں کی طرح اپنے جذبات کا اظہار کرنا نہیں آتا باپ کی محبت اکثر خاموش ہوتی ہے لیکن بظاہر رعب اور دبدبے والی اس شخصیت کے پیچھے ایک شفیق اور مہربان شخص چھپا ہوتا ہے جو زندگی کے سرد و گرم پہاڑوں اور صحراؤں سے گزرتے ہوئے۔ اپنے آپ کو بچوں کے سامنے باہمت اور طاقتور دکھاتا ہے سنجیدگی سے مسلسل کاموں میں مصروف رہتے ہوئے اپنے دل میں محبت و ایثار، شفقت، فلک بوس احساسات اور تحفظ چھپائے رکھتا ہے تاکہ بچوں کے چہروں پر مسکراہٹ قائم رہے اس کے جگر گوشوں کو کسی طرح کی کوئی تکلیف نا ہو کسی چیز کی کمی یا حسرت نہ رہے کوئی تشنگی باقی نا رہے۔

اپنی خواہشات، اپنی پسند، اپنی ذات اپنی ترجیحات کو یکسر فراموش اور نظرانداز کر کے اولاد کو مسلسل روشنی فراہم کرتا ہے چاند کی پچھلی سطح پوری دنیا کی نظروں سے اوجھل رہتی ہے، چاند کی نظر آنے والی سطح تو مسلسل روشنی منعکس کر کے پورے ماحول کو روشن کرتی ہے جبکہ پچھلی سطح ہمیشہ مکمل تاریکی میں ڈوبی رہتی ہے۔

باپ بھی کس قدر سمجھدار ہے جو اپنا صرف روشن چہرہ ہی اولاد کو دکھاتا ہے اور گہرا اندھیرا تاریکی میں ڈوبا ہوا اپنا باطنی چہرہ کسی صورت بھی دکھانے سے رہا اس کا ہر ہر ردعمل اولاد کی بھلائی کے لیے ہوتا ہے لیکن اک اولاد اس خاموش اور چھپی ہوئی محبت کو کم کم ہی محسوس کر پاتی ہے۔

خود خستہ حال زندگی گزار کر اولاد کو ہشاس و بشاش اور خوش و خرم زندگی عطا کرتا ہے اور اس کے لیے گاؤں گاؤں قریہ قریہ شہر شہر چکر لگاتا ہے تپتی دھوپ میں سفر کرتا ہے خود سڑا دینے والی گرمی میں بغیر اے سی کے اپنا سفر طے کرتا ہے تاکہ اس کے بچے ائرکنڈیشن میں سفر کر کے شدت حرارت اور گہما گہمی کی تکلیفوں سے محفوظ رہیں ان کو ان آزمائشوں کا سامنا نا کرنا پڑے جو وہ خود ان کی پیدائش سے پہلے ہی جب وہ مادر رحم میں نطفہ کی شکل میں موجود ہوتے ہیں ان کی آرائش اور آرام کے لئے ان آزمائشوں کا سامنا کرنا شروع کر دیتا ہے خود اسٹیشن پر لگے ہوئے نل کا گرم پانی پینے پر اکتفا کرتا ہے تاکہ کچھ رقم بچا کر گھر کے لیے اک فرج خرید سکے جس سے اسکی اولاد گرمی کے موسم میں کا ٹھنڈا پانی پی کر اپنے حلق و روح کو تر کر سکے جسمانی صعوبتیں تو انسان جیسے تیسے جھیل لیتا ہے وقت کے ساتھ ساتھ جسمانی زخم مندمل ہو ہی جاتے ہیں لیکن اک باپ اپنے بچوں کے لیے اہل خانہ کے لیے صرف جسم کی قربانی نہیں دیتا بلکہ بسا اوقات روح و ضمیر کو بھی مجروح اور مارنے پر مجبور ہو جاتا ہے زمانے کی تلخ کلامیوں اور کڑوی باتوں کو سنتا ہے تیر کی مانند دل پر ضرب لگانے والی لوگوں کی اٹھتی نظروں کو برداشت کرتا ہے اور بچوں کو کانوں کان خبر تک نہیں ہونے دیتا کتنی ہی بڑی پریشانی کیوں نا آجائے اک باپ بچوں کے سامنے کبھی بھی ناامیدی اور مایوسی کی بات ہرگز نہیں کر سکتا بلکہ انکا سہارا اور طاقت بن جاتا ہے اور کہتا ہے کہ فکر کیوں کرتے ہو ابھی تمہارا باپ زندہ ہے۔

وہ ایسا نگہبان ہے جو ساری زندگی خاندان خصوصاً اولاد کی نگہبانی اور نگرانی کرتا ہے بچوں کی کامیابی پر پھولے نہیں سماتا والد کی شخصیت ہی ایسی ہوتی ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ جو کام میں نہیں کر سکا میرے بچے کریں جو سہولیات مجھے میسر نہیں ہوئیں میرے بچے اس سے محروم نا رہیں باپ نا صرف ایک کفیل ہوتا ہے بلکہ ایک رہنما اور استاد بھی ہوتا ہے جو زندگی کے ہر مشکل موڑ پر اولاد کی رہنمائی اور ہدایت کرتا ہے اس کی شفقت اور رہنمائی بچوں کو زندگی کے نشیب و فراز میں حوصلہ دیتی ہے اور جب یہی مخلص باپ نہ ہو تو زندگی کی دوڑ میں اچھا مشورہ دینے والا کوئی نہیں ہوتا، باپ اک مضبوط و مستحکم ستون ہوتا ہے جو اولاد کے لیے معاشرے کے اندر مضبوط سہارا اور آس تصور کیا جاتا ہے، لیکن وہ کتنا ہی مضبوط کیوں نا ہو آخر کار وہ اک انسان ہی ہے کوئی فرشتہ نہیں جسے تھکاوٹ محسوس نا ہو جو کبھی کمزور نا پڑے، نہیں نہیں وہ کتنا ہی مضبوط اور مستحکم کیوں نا ہو لیکن وہ ہے ایک انسان ہی مرور زمانہ اور گردشِ دوراں سے اب اسکا جسم کمزور و ناتواں ہو چکا ہے پیر کمزوری کے باعث لڑکھڑانے لگے ہیں بازوؤں میں اب طاقت نہیں رہی۔

باپ کی شکل میں یہ مضبوط درخت اب کمزور ہونے لگا ہے پھلوں کا سلسلہ اب منقطع ہوگیا ہے زندگی کے نشیب و فراز حالات سے لڑلڑ کر تھک ہار چکا ہے اب اس مضبوط و مستحکم باپ کے بازوؤں میں طاقت نہیں بچی ہاتھ کانپنے لگے اس کے پاؤں میں کھڑے ہونے کی سکت نہیں رہی سانسوں کا توازن برقرار نہیں رہتا جسم لاگر ہوچکا ہے پورا جسم امراض کا ٹھکانہ بن چکا ہے وہ باپ جس نے بچوں کے لیے سب کچھ قربان کردیا تن من دھن سب کچھ زندگی کی کوئی خود فراموشی نہیں جو اس پر طاری نا ہوئی ہو اور راحت و آسائش کی کوئی قربانی نہیں جس سے اسے گریز ہو

ہر حالت اور ضرورت کے مطابق ضروریات مہیا کرتا رہا اور نگرانی و حفاظت کا ایک مسلسل اہتمام جاری رہا لیکن جب اس پر بڑھاپا حاوی ہوگیا ایسے کمزور حالات میں اولاد اس سے اپنی نظریں پھیر لیتی ہے اس کے سامنے مسکرانا تک گوارہ نہیں کرتی اپنے چوبیس گھنٹے میں سے تھوڑا سا وقت ان کے ساتھ گزارنے کے لیے تیار نہیں ،جبکہ ان کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ آج اس دنیا میں وہ جس بھی مقام پر ہیں وہ سب ان کے والد کی مرہون منت اور احسان ہے جب کبھی خود پسندی کے عالم میں ہوں تو ان کو احساس ہونا چاہیے اس نعمت کا سبب انکا باپ ہے والدین میں سے کوئی بھی اپنی عمر کو پہنچ جائیں تو اولاد پر لازمی ہے کہ انکی خدمت میں حاضر رہے انکا ہر طرح سے خیال رکھا جائے انکی ضروریات کو مقدم رکھا جائے یہ ایسا وقت ہوتا ہے کہ اولاد کی معمولی سی تبدیلی اور غفلت بھی بوڑھے اور ضعیف والدین کے دل پر تیر کی طرح چھبتی محسوس ہوتی ہے اور معمولی سی توجہ اور پیار بھی انکو جوان اور خوش و خرم کردیتی ہے بڑھاپا بچپن کی طرح ہوتا ہے جیسے بچے کو عہد طفولیت میں بہت سارا پیار ، محبت و شفقت اور نرمی کی ضرورت ہوتی ہے بالکل ایسے ہی بوڑھے ماں باپ کو بھی بڑھاپے میں اپنی اولاد کی طرف سے اسی کی چاہت اور امید ہوتی ہے لیکن عصر حاضر میں الواد کی جانب سے اس قدر تساہل اور خود پسندی کا مظاہرہ دیکھنے کو ملتا ہے جس سے دل کٹ جاتا ہے جسکے والدین خصوصاً جب باپ اس دنیا سے رخصت ہوجاتا ہے پھر اس کے جانے کے بعد جو خلاء پیدا ہوتا ہے وہ عمر بھر کی تڑپ کو جنم دیتا ہے اور کبھی پورا نہیں ہوتا لیکن والد کی زندگی میں انکی قدر و منزلت کا مکمل ادراک نہیں ہوپاتا ۔

جب وہ دنیا سے رخصت ہوجاتا ہے بچوں سے باپ کا سایہ چھن جاتا ہے پھر باپ کی اہمیت و ضرورت کا احساس ہوتا ہے بلکہ باپ کا صرف ہونے سے ہی اولاد کو کتنی تقویت ملتی ہے یہ چیز باپ کے فوت ہوجانے کے بعد پتہ چلتا ہے دنیا والوں کی کڑوی اور زہر آلود باتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے جب باپ کا سینہ موجود نہیں ہوتا تب یہ احساس جاگتا ہے کہ باپ کا بیٹوں کی زندگی میں ہونا کتنی بڑی نعمت ہے بلکہ ماں باپ دونوں ہی ایک عظیم نعمت ہیں جنہیں خدا نے ہمارے لئے تحفہ بنا کر بھیجا ہے ۔ ہمیں چاہیے کہ ہم ان کی قدر کریں ، ان کی ہر ضرورت کا خیال رکھا جائے ان کے سامنے سر جھکا کر بات کریں ان کے ساتھ ادب سے پیش آئیں ان کے سامنے اونچی آواز میں بات نہ کی جائے ان کا ذکر اچھے الفاظ میں کیا جائے جب بھی ملیں خنداں پیشانی سے ملیں ان کے سامنے اپنے بازو جھکا کر رکھیں ، ان کے لئے راحت کا ذریعہ بنیں حتی المقدور ان کو راضی و قانع رکھنے کی کوشش ہو تاکہ ان کے دل سے دعائیں نکلیں ماں باپ

کی خدمت سے زندگی میں خوشحالی آتی ہے، رزق میں برکت ہوتی ہے، اولاد فرمانبردار ہوتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان کے حق میں دعا کے لیے ہمارے ہاتھ ہمیشہ بلند ہوں (رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا) (سورۃ الإسراء: 24)

کہ اے اللہ میرے والدین پر اسی طرح رحم فرما جس طرح انھوں نے بچپن میں مجھ پر رحم و کرم کیا تھا اللہ تعالیٰ نے خود یہ دعا ہمیں سکھائی ہے ہمیں اس دعا کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیے۔

✍ سعودی عرب روے زمین کا وہ انوکھا ملک ہے جہاں پر بزرگوں کے مزارات، دوسروں کی عبادت گاہیں، شراب خانے، فحاشی کے اڈے سرے سے نہیں ہیں جو بہت سارے ممالک میں حکومت کی زیر سرپرستی و پرمیشن سے قائم ہی نہیں بلکہ آمدنی کے اہم ذرائع ہیں، یہاں پر مسجد حرام و مسجد نبوی تک میں ڈونیشن باکس نہیں رکھے گئے ہیں جہاں بروقت پورے سال حجاج، معتمرین اور زائرین کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر نظر آتا ہے اب ایسے میں کیا کوئی سلیم الفطرت انسان اس ملک کی برائی سرعام کر سکتا ہے جس نے شرک و بدعت اور فحاشیت و منشیات کے روک تھام کیلیے ٹھوس اقدامات کیے ہوں جو فساد و بگاڑ کے سب سے بڑے عوامل ہیں۔

شیخ نثار احمد مدنی

"اگر ایک کتاب کی 70 مرتبہ بھی تصحیح کی جائے تب بھی اس میں کوئی نہ کوئی غلطی نکل آتی ہے، کیوں کہ اللہ کی کتاب کے علاوہ کوئی دوسری کتاب غلطی سے پاک ہو نہیں سکتی!"

امام ابراہیم بن اسماعیل مزنی رحمہ اللہ (الموضح للخطیب: 1/6)

قربانی پر جدید اعتراضات کا شرعی و عقلی رد

محمد جریج شریف احمد

اسلام ایک ایسا ہمہ گیر دین ہے جو انسانی زندگی کے ہر پہلو کو الٰہی ہدایت کے نور سے منور کرتا ہے۔ اس دینِ کامل کی عبادات محض رسمی اعمال نہیں، بلکہ ان کے پیچھے عمیق مقاصد، روحانی اسرار، اور معاشرتی فوائد پوشیدہ ہوتے ہیں۔ انہی عبادات میں سے ایک عظیم عبادت "قربانی" ہے جو سنتِ ابراہیمی کی یادگار، فدائیت و اطاعت کا مظہر اور معاشرتی مساوات کا عملی نمونہ ہے۔ ہر سال عید الاضحیٰ کے موقع پر مسلمان دنیا بھر میں اس شعائرِ اسلامی کو بڑے جوش و خلوص سے ادا کرتے ہیں۔

تاہم جدید ذہن، جو مادیت پرستی، سائنسی محدودیت یا ثقافتی مغرب زدگی کا شکار ہو چکا ہے، وہ ہر دینی شعائر کو عقلِ ناقص کے ترازو پر تولنے کی کوشش کرتا ہے۔ نتیجتاً قربانی جیسی پاکیزہ اور بامقصد عبادت پر بھی اعتراضات اٹھائے جاتے ہیں، مثلاً: جانوروں پر ظلم، وسائل کا ضیاع، ماحولیاتی نقصان، یا گوشت کا ضیاع۔ ان اعتراضات میں بعض نادانستہ غلط فہمیوں پر مبنی ہوتے ہیں، تو بعض مخصوص فکری ایجنڈوں اور اسلامی شعائر سے عناد کے نتیجے میں ابھرتے ہیں۔

زیرِ نظر مضمون میں ان اعتراضات کا علمی و عقلی تجزیہ کیا گیا ہے، نیز ان کے جوابات کو نہ صرف شرعی دلائل کی روشنی میں بلکہ سائنسی، سماجی اور فطری اصولوں کی بنیاد پر بھی پیش کیا گیا ہے، تاکہ ایک علمی اور متوازن فہم قاری کے سامنے آئے، اور قربانی جیسی عظیم عبادت کی افادیت، معنویت اور حکمت واضح ہو کر سامنے آ سکے۔

اعتراض 1 : قربانی ایک "وحشیانہ فعل" ہے۔

جواب : قربانی پر اعتراض کرنے والے بعض لوگ جانوروں کے حقوق اور ہمدردی کا نعرہ بلند کرتے ہیں اور قربانی کو "وحشیانہ فعل" قرار دیتے ہیں، لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ یہی لوگ سال بھر گوشت کھانے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔ وہ مختلف گوشت سے بنی مصنوعات کو بڑے شوق سے استعمال کرتے ہیں، لیکن ان کے لیے جانوروں کے حقوق اس وقت کوئی مسئلہ نہیں بنتے۔

یہ اعتراض کرنے والے اس وقت خاموش رہتے ہیں جب سپین میں "بل فائٹنگ" کے نام پر ہزاروں بیلوں کو شدید اذیت دے کر قتل کیا جاتا ہے، جہاں ہجوم کے سامنے انہیں زخموں سے چور کر کے موت کے گھاٹ اتارا جاتا ہے، ڈنمارک میں "گرائنڈا ڈرپ" تہوار کے نام پر ہر سال ہزاروں ڈولفنز کو بے رحمی سے قتل کر دیا جاتا ہے، یہاں تک کہ سمندر کا پانی سرخ ہو جاتا ہے، آسٹریلیا

میں پانی کی قلت کے بہانے ہزاروں اونٹوں کی حکومتی سرپرستی میں ٹارگٹ کلنگ کی جاتی ہے، زمبابوے میں ایک امریکی شکاری "والٹر جیمز پالمر" نے 5000 ہاتھی، 800 جنگلی بھینسے، اور بے شمار دوسرے نایاب جانور محض تفریح کے لیے قتل کرڈالے، یہودیوں کے مذہبی تہوار "کپروت" میں ہزاروں مرغیوں کو پتھروں سے کچل دیا جاتا ہے (1)

لیکن اس پر عالمی میڈیا میں کوئی شور نہیں مچایا جاتا۔ یہ تمام اعمال کیا وحشیانہ نہیں؟ اگر وحشیانہ ہیں، تو قربانی پر اعتراض کیوں؟ اور اگر نہیں، تو پھر قربانی کو نشانہ بنانے کے پیچھے اصل مقصد کیا ہے؟

معترضین کو یہ جاننا چاہیئے کہ اسلامی طریقہ قربانی کسی بھی دوسرے طریقے سے زیادہ رحم دلی پر مبنی ہے

چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إِنَّ اللَّهَ كَتَبَ الْإِحْسَانَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ، فَإِذَا قَتَلْتُمْ فَأَحْسِنُوا الْقِتْلَةَ، وَإِذَا ذَبَحْتُمْ فَأَحْسِنُوا الذِّبْحَ، وَلْيُحِدَّ أَحَدُكُمْ شَفْرَتَهُ، وَلْيُرِحْ ذَبِيحَتَهُ(2)

بے شک اللہ نے ہر چیز میں احسان (اچھا برتاؤ) لازم کیا ہے، جب تم قتل کرو تو عمدگی سے قتل کرو، اور جب تم ذبح کرو تو اچھے طریقے سے ذبح کرو، اور تم میں سے ہر ایک اپنی چھری کو تیز کر لے اور ذبیحہ کو آرام دے۔

اسلامی طریقہ کار میں جانور کے لیے کم سے کم تکلیف کا اصول اپنایا جاتا ہے تو دوسری طرف، وہ ممالک جہاں اسلامی اصولوں کے برخلاف جانوروں کو قتل کیا جاتا ہے، وہاں کے طریقے ہی دراصل وحشیانہ ہیں:

چین اور کوریا میں زندہ جانوروں کو ابالتے ہوئے مارا جاتا ہے، مغربی ممالک میں جھٹکے (Stunning) سے جانوروں کو بے ہوش کر کے مارا جاتا ہے، جو اکثر انتہائی تکلیف دہ ہوتا ہے، گوشت کی صنعت میں کئی بار جانوروں کو بے دردی سے مشینی انداز میں قتل کیا جاتا ہے، جہاں وہ شدید تکلیف میں تڑپتے ہیں۔ (3)

لیکن ان شرپسندوں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں دراصل یہ تضاد ثابت کرتا ہے کہ اعتراض کا مقصد جانوروں کی ہمدردی نہیں، بلکہ اسلامی شعائر کو نشانہ بنانا ہے۔ قربانی ایک عبادت ہے جس میں مالی ایثار، اللہ کی رضا، اور غریبوں کی مدد شامل ہے۔ لیکن کچھ طاقتیں مسلمانوں کی عبادات پر حملہ آور ہو کر انہیں بدنام کرنا چاہتی ہیں۔

اعتراض 2: قربانی کا پیسہ غریبوں پر خرچ کرنا چاہیے۔

جواب : یہ ایک ناقص سوچ ہے خیرات اپنی جگہ ایک مستحسن عمل ہے، مگر قربانی کا ایک خاص دینی و روحانی مقام ہے جو کسی اور عمل سے تبدیل نہیں ہو سکتا۔ اگر عبادات کو مالی فوائد کی بنیاد پر پرکھا جائے، تو پھر حج، زکوۃ، اور دیگر عبادات پر بھی یہی اعتراضات کیے جا سکتے ہیں۔

قارئین! قربانی محض ایک مذہبی فریضہ نہیں، بلکہ ایک سماجی و معاشی عمل بھی ہے جو غرباء کی مدد کا ایک مؤثر ذریعہ بنتا ہے۔ قربانی کا گوشت صرف امیر افراد کے لیے مخصوص نہیں بلکہ اس کا ایک بڑا حصہ انہی ضرورت مندوں تک پہنچتا ہے جو سال بھر گوشت کھانے سے محروم رہتے ہیں۔ اس سے نہ صرف ان کی غذائی ضروریات پوری ہوتی ہیں بلکہ انہیں عید کی خوشیوں میں شامل ہونے کا موقع بھی ملتا ہے اور یہ تصور کہ قربانی پر خرچ ہونے والا پیسہ ضائع ہو جاتا ہے، بالکل غلط ہے۔ حقیقت میں قربانی ایک مکمل معاشی سرگرمی ہے، جو کئی صنعتوں کو سہارا دیتی ہے۔ جانور پالنے والے کسان، قصاب، چمڑے کی صنعت، خوراک کا کاروبار اور دیگر کئی شعبے اس سے براہِ راست فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس پیسے کی گردش غربت میں کمی اور مقامی معیشت کے استحکام میں مدد دیتی ہے، اس کے برعکس، دنیا میں بے شمار مواقع پر وسائل کی غیر ضروری بربادی کی جاتی ہے، مگر اس پر کوئی سوال نہیں اٹھایا جاتا۔

مثال کے طور پر ہر سال اربوں ڈالر تعیشات، فیشن، اور تفریحی سرگرمیوں پر خرچ ہوتے ہیں۔ پالتو جانوروں کے مہنگے کھلونے، لگژری برانڈز کے ملبوسات اور کاسمیٹکس انڈسٹری میں جانوروں پر کیے جانے والے بے شمار مہنگے تجربات کو شاید ہی کبھی فضول خرچی سمجھا جاتا ہے۔ اگر قربانی پر یہ اعتراض اٹھایا جاتا ہے کہ اس رقم کو غریبوں پر خرچ کیا جانا چاہیے، تو یہی اصول دیگر فضول خرچیوں پر کیوں لاگو نہیں کیا جاتا؟

لہٰذا اگر وسائل کے دانشمندانہ استعمال پر گفتگو کرنی ہے، تو یہ بحث محض قربانی تک محدود نہیں ہونی چاہیے۔ ہمیں ہر قسم کے اخراجات پر نظر ڈالنی چاہیے اور ان کے حقیقی فوائد اور نقصانات کا موازنہ کرنا چاہیے، تاکہ انصاف پر مبنی نتیجہ اخذ کیا جا سکے۔

اعتراض 3 : قربانی کی بجائے فلاحی کام کیوں نہ کیے جائیں؟

جواب : قربانی کو کسی فلاحی کام سے تبدیل کرنے کی سوچ دراصل عبادات کی روح کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ اسلام نے جہاں خدمت خلق کا حکم دیا ہے، وہیں عبادات کو بھی لازمی قرار دیا ہے۔ لہٰذا، قربانی ایک عبادت ہے، اور عبادت کا نعم البدل فلاحی خدمت نہیں ہو سکتی، بلکہ دونوں ساتھ ساتھ چلتی ہیں اور ایک خوبصورت معاشرہ تشکیل دیتی ہیں۔ اللہ رب العزت نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیتے ہوئے فرمایا

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ (4)

اپنے رب کے لیے نماز پڑھو اور قربانی کرو۔

یہ آیت قربانی کو ایک باقاعدہ عبادت کے طور پر بیان کرتی ہے، جو کہ دیگر عبادات کی طرح ترک نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ کسی عبادت کو دنیاوی مفاد یا فلاحی نقطہ نظر سے ترک کرنا شریعت کی روح کے خلاف ہے۔ اگر عبادت کو فلاحی کام سے بدلا جائے تو: نماز کے وقت کسی غریب کی خدمت کو نماز کہہ دیں؟ روزے کے بجائے کسی کو صدقہ کر دیں؟ حج کے بجائے اسکول بنوا دیں؟ کیا ان عبادات کو فلاحی کاموں سے بدلنے کی اجازت دی جا سکتی ہے؟ یقیناً نہیں۔ عبادت، عبادت ہی رہے گی، اس کا دنیاوی متبادل ممکن نہیں۔

چنانچہ قربانی عبادت بھی ہے اور فلاحی خدمت بھی، قربانی کے ایام میں لاکھوں جانور ذبح ہوتے ہیں جن سے ہزاروں افراد (قصائی، کھالیں صاف کرنے والے، گوشت سپلائی کرنے والے) کو روزگار ملتا ہے معاشی سرگرمیاں بڑھتی ہیں دیہی معیشت (مویشی پال حضرات) کو سہارا ملتا ہے گویا عبادت اور خدمتِ خلق ایک ساتھ موجود ہے۔ فلاحی مقصد قربانی سے خود بخود حاصل ہو جاتا ہے۔ دوسری بات اسلام نے زکوٰۃ، صدقات، فدیہ، کفارہ، عطیات، ہبہ، قرض حسنہ، وقف جیسے لاتعداد فلاحی ذرائع کو فروغ دیا ہے، قربانی کے لیے سال میں صرف ایک مخصوص موقع مقرر ہے، جب کہ فلاحی کام ہمیشہ جاری رہ سکتے ہیں۔

اعتراض 4: قربانی جانوروں کی نسل کشی کا سبب بنتی ہے

جواب: مغربی افکار سے متاثر کچھ لوگ قربانی پر یہ اعتراض اٹھاتے ہیں کہ لاکھوں جانور ذبح کرنے سے ان کی نسلوں میں کمی آتی ہے اور یہ ایک طرح کا غیر ضروری قتل عام ہے۔ لیکن اگر ہم اس مسئلے کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ اعتراض محض ایک پروپیگنڈہ ہے جس کی حقیقت کچھ اور ہے۔

قربانی کے لیے مخصوص جانوروں کی نسل کبھی کم نہیں ہوئی بلکہ ان کی افزائش میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ یہ ایک فطری اصول ہے کہ جس چیز کی طلب زیادہ ہو، اس کی پیداوار بھی بڑھتی ہے۔ یہی اصول قربانی کے جانوروں پر بھی لاگو ہوتا ہے۔ مسلمان ہر سال قربانی کے لیے بڑے پیمانے پر جانور خریدتے ہیں، جس کی وجہ سے مویشی پالنے والے کسان اور فارمرز زیادہ جانور پالتے ہیں تاکہ اگلے سال مزید طلب کو پورا کیا جا سکے۔ وہ ممالک جہاں قربانی کی روایت نہیں ہے یا بہت کم کی جاتی ہے، وہاں کے مویشیوں کی نسل کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بتدریج کم ہو رہے ہیں۔ مثال کے طور پر، کچھ یورپی ممالک میں گائے کی نسل میں کمی دیکھنے میں آئی، کیونکہ وہاں گوشت کے لیے جانوروں کا استعمال کم ہو گیا تھا۔ اس کے برعکس، مسلمان ممالک میں جہاں قربانی کا رجحان زیادہ ہے، وہاں مویشیوں کی تعداد مسلسل بڑھ رہی ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کا طے کردہ اصول ہے کہ جس چیز کی طلب زیادہ ہو، اس کی فراہمی بھی اسی تناسب سے ہوتی ہے۔ جب تک قربانی کا عمل جاری ہے، مویشی پالنے کی صنعت ترقی کرے گی اور جانوروں کی نسل میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ دنیا بھر میں جتنے بھی مویشی پائے

جاتے ہیں، ان کی بقاء انسانوں کی ضروریات سے جڑی ہوئی ہے۔ اگر قربانی یا گوشت کھانے کی روایت ختم کردی جائے تو ان جانوروں کی افزائش بھی کم ہو جائے گی اور وہ معدوم ہونے لگیں گے، جن جانوروں کو انسانوں نے اپنی ضروریات کے لیے پالنا چھوڑ دیا، وہ آہستہ آہستہ ختم ہو گئے۔ مثال کے طور پر، گھوڑوں کی کچھ نسلیں ناپید ہو رہی ہیں کیونکہ جدید دور میں ان کا استعمال کم ہو گیا ہے۔ لیکن گائے، بکرے اور اونٹ کی نسلیں نہ صرف باقی ہیں بلکہ مسلسل بڑھ رہی ہیں، کیونکہ ان کی افزائش میں انسانوں کا عمل دخل ہے۔

اعتراض 5 : قربانی محض انسانی لذت کے لیے کی جاتی ہے؟

جواب : بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ قربانی کا مقصد صرف انسانوں کی گوشت خوری ہے اور یہ عمل جانوروں پر ظلم کے مترادف ہے۔ لیکن اگر ہم اس مسئلے کو دینی، عقلی اور سائنسی نقطہ نظر سے دیکھیں تو حقیقت بالکل مختلف نظر آتی ہے۔

1 : اسلامی نقطہ نظر : قربانی محض ایک رسم نہیں بلکہ اللہ کی رضا کے لیے کی جانے والی ایک مقدس عبادت ہے۔ اس کا اصل مقصد صرف گوشت کھانا نہیں بلکہ اپنی خواہشات کو اللہ کے حکم کے تابع کرنا اور تقویٰ اختیار کرنا ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

لَنْ يَنَالَ اللَّهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلَكِنْ يَنَالُهُ التَّقْوَى مِنْكُمْ(5)

اللہ کو نہ ان جانوروں کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون، بلکہ تمہارا تقویٰ (پرہیزگاری) اس تک پہنچتی ہے۔

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ قربانی کا اصل مقصد روحانی اصلاح ہے نہ کہ محض گوشت خوری۔

2 : فطری اور سائنسی پہلو : دنیا میں موجود تمام جاندار کسی نہ کسی شکل میں ایک دوسرے کے لیے خوراک بنتے ہیں۔ شیر، چیتے اور دیگر شکاری جانور بھی دوسرے جانوروں کو کھاتے ہیں، لیکن کسی نے انہیں ظالم نہیں کہا۔ اسی طرح، پودوں کو کاٹ کر کھانے، دودھ، انڈے اور دیگر حیوانی مصنوعات کا استعمال بھی کسی نہ کسی درجے میں زندگی کے خاتمے کا باعث بنتا ہے۔ اگر گوشت کھانا ظلم ہے تو پھر دودھ، شہد اور دیگر حیوانی اشیاء کے استعمال پر بھی اعتراض ہونا چاہیے۔ دراصل انسان کی جسمانی ساخت، جیسے دانتوں کی بناوٹ، ہاضمے کا نظام، اور غذائی ضروریات، اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ انسان فطری طور پر ایک ہمہ خور (omnivore) یعنی گوشت اور نباتات دونوں کھانے والا جاندار ہے، اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے مخصوص حلال جانوروں کو پیدا کیا ہے۔ قرآن میں ہے :

وَالْأَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيهَا دِفْءٌ وَمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ(6)

اور ان چوپایوں کو اسی نے پیدا کیا، ان میں تمہارے لیے گرمی حاصل کرنے کا ذریعہ بھی ہے اور دیگر فائدے بھی ہیں، اور ان میں سے کچھ کو تم کھاتے ہو۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ جانوروں کو انسان کی ضروریات کے لیے پیدا کیا گیا ہے، اور انہیں کھانا فطری عمل ہے۔

لہذا قربانی صرف گوشت کھانے کے لیے نہیں بلکہ اللہ کی رضا اور قربانی کے جذبے کو فروغ دینے کے لیے کی جاتی ہے۔ اگر یہ عمل ظلم ہوتا تو اللہ تعالیٰ اسے حکم نہ دیتے اور نہ ہی نبی کریم ﷺ خود اس پر عمل کرتے، قربانی ایک مکمل عبادت اور سماجی بھلائی کا ذریعہ ہے، جسے محض گوشت خوری سے جوڑنا حقیقت سے انحراف ہے۔

اعتراض 6 : قربانی ماحول کے لیے نقصان دہ ہے۔

جواب : قربانی کو ماحولیاتی نقصان سے جوڑنے کا اعتراض اگر عقلی، نقلی، سائنسی اور سماجی کسی بھی پہلوؤں سے جانچا جائے تو یہ محض غلط فہمی یا تعصب پر مبنی محسوس ہوتا ہے۔ اسلامی تعلیمات، جدید تحقیق اور عملی تجربات اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ قربانی ایک منظم، محفوظ اور بامقصد عبادت ہے، جو نہ صرف روحانی طہارت کا ذریعہ ہے بلکہ معاشرتی ہمدردی اور ثقافتی شناخت کی علامت بھی ہے۔

قربانی سے ماحولیاتی آلودگی کا دعویٰ اگر حقیقت پر مبنی ہوتا تو حج کے موقع پر ہر سال تقریباً 10 لاکھ جانور سعودی عرب میں ایک محدود جگہ (مکہ مکرمہ اور منیٰ) پر ذبح کیے جاتے ہیں، لیکن ماحولیاتی آلودگی یا بیماریوں کا کوئی بڑا بحران سامنے نہیں آیا, سعودی حکومت، بلدیہ اور علماء کرام کے اشتراک سے قربانی کے خون، ہڈیوں، آلائشوں کو سائنسی انداز میں ٹھکانے لگایا جاتا ہے۔

یہی ماڈل دنیا کے اکثر مسلم ممالک میں اختیار کیا جارہا ہے، جس سے قربانی ایک صاف ستھرا، نظم و ضبط والا عمل بنتا جارہا ہے۔

اگر قربانی ماحولیاتی لحاظ سے نقصان دہ ہوتی، تو صدیوں سے یہ عبادت دنیا کے مختلف خطوں میں نہ کی جاتی، جدید ممالک (ترکی، سعودی عرب، ملیشیا) میں اس پر پابندی عائد کر دی جاتی، ساتھ ہی حج کے موقع پر عالمی ادارے ماحولیات پر تنقید کرتے، جبکہ وہاں WHO سمیت تمام ادارے منظم قربانی کے عمل کی تعریف کرتے ہیں(7)

جو مسائل بعض علاقوں میں پائے جاتے ہیں (مثلاً آلائشوں کا دیر سے اٹھایا جانا، یا کھلے عام ذبح)، وہ عبادت نہیں بلکہ انتظامی کوتاہی ہے۔ اس کا حل قربانی کو روکنا نہیں بلکہ بلدیاتی نظام کو مضبوط کرنا ہے۔

اعتراض 7 : قربانی کے گوشت کا ضیاع ہوتا ہے۔

جواب : یہ اعتراض حقیقت سے بعید اور زمینی حقائق کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہے۔ قربانی کا ایک بنیادی مقصد ہی یہ ہے کہ اس کا گوشت مستحقین، غرباء اور محروم طبقات تک پہنچایا جائے۔ قرآن مجید میں واضح حکم ہے :

فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيرَ(8)

یعنی : پھر تم خود بھی اس میں سے کھاؤ اور فقیر و محتاج کو بھی کھلاؤ۔

ہمارے معاشرے میں قربانی کے گوشت کو تقسیم کرنے کا جو رواج ہے، وہ دنیا بھر میں ایک نمایاں مثال کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ محلہ، گاؤں، شہر—ہر سطح پر لوگ نہ صرف عزیز و اقارب بلکہ مستحقین، ملازمین، اور غریبوں تک گوشت پہنچاتے ہیں۔ بہت سے گھرانے مخصوص حصے الگ کر کے صرف محتاجوں کے لیے رکھتے ہیں، یہاں تک کہ بعض لوگ جانور صرف اسی نیت سے ذبح کرتے ہیں کہ سارا گوشت مستحقین کو دیں گے۔

سعودی عرب میں ہر سال حج کے موقع پر لاکھوں جانور قربان کیے جاتے ہیں۔ اس بڑے پیمانے پر ہونے والی قربانی کے گوشت کو منظم طریقے سے مستحقین تک پہنچانے کے لیے سعودی پروجیکٹ برائے استفادہ از قربانی کا گوشت (Adahi Project) کام کرتا ہے۔ اس منصوبے کے تحت قربانی کا گوشت نہ صرف مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے محتاجوں میں تقسیم کیا جاتا ہے، بلکہ اسے محفوظ کر کے دنیا کے مختلف غریب ممالک تک بھی پہنچایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر، 2017 میں اس منصوبے کے تحت 30 ملین سے زائد ضرورت مند افراد کو 27 ممالک میں قربانی کا گوشت فراہم کیا گیا۔

اس منصوبے کے تحت گوشت کو جدید تکنیکی طریقوں سے محفوظ کیا جاتا ہے تاکہ یہ طویل مدت تک قابل استعمال رہے اور دور دراز علاقوں تک پہنچایا جا سکے۔ اس کے علاوہ قربانی کے جانوروں کی صحت اور معیار کو یقینی بنانے کے لیے ماہرین حیوانات اور شریعت کے علماء کی نگرانی میں یہ عمل مکمل کیا جاتا ہے۔ (9)

لہذا یہ کہنا کہ قربانی کے گوشت کا ضیاع ہوتا ہے، ایک غیر مستند دعویٰ ہے۔ حقیقت میں قربانی کا گوشت مستحقین تک پہنچانے کے لیے منظم اور موثر نظام موجود ہے جو اس عبادت کے سماجی اور فلاحی پہلو کو مزید اجاگر کرتا ہے۔

اعتراض 8: قربانی سے دل سخت ہوتا ہے۔

جواب: قربانی دل کی سختی کا باعث کیسے ہو سکتی ہے جبکہ اس کا مقصد ہی دل کو نرم بنانا، اللہ کی اطاعت سکھانا اور دوسروں کے ساتھ ایثار کا جذبہ پیدا کرنا ہے؟

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی ہمیں ایثار، اطاعت اور خلوص کی بے نظیر مثال پیش کرتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خواب میں اپنے بیٹے کو قربان کرنے کا حکم ملا، اور انہوں نے بغیر کسی تردد کے اللہ کا حکم مانا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے بھی فرمایا: اے ابا جان! آپ کو جو حکم دیا گیا ہے اسے انجام دیں، ان شاء اللہ آپ مجھے صابر پائیں گے۔ (10)

یہ منظر خود گواہ ہے کہ قربانی کا عمل دل کی سختی نہیں بلکہ اللہ کی رضا کے لیے اعلیٰ درجے کا ایثار اور تسلیم و رضا کا مظاہرہ ہے۔ اگر یہ عمل دل کو سخت کرتا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے نبی اور حضرت اسماعیل علیہ السلام جیسے فرماں بردار بیٹے کو اللہ کبھی اس امتحان سے نہ گزارتا۔

حقیقت یہ ہے کہ قربانی صرف ایک مذہبی رسم نہیں بلکہ ایک سماجی اور اخلاقی تربیت کا ذریعہ بھی ہے۔ قربانی کے ذریعے ہم اللہ کی رضا کے لیے جانور ذبح کرتے ہیں اور اس کا گوشت غریبوں اور ضرورت مندوں میں تقسیم کرتے ہیں، جو شاید سال بھر گوشت کھانے کی استطاعت نہ رکھتے ہوں۔ یہ عمل دل میں ہمدردی، اخوت اور بھائی چارے کو فروغ دیتا ہے۔ اگر قربانی دل کو سخت کرتی تو لوگ اسے خوشی سے انجام نہ دیتے، بلکہ اس سے اجتناب کرتے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ہر سال کروڑوں مسلمان جذبۂ ایمانی کے ساتھ اس عبادت کو ادا کرتے ہیں، اور نہ صرف خود فائدہ اٹھاتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی خوشی میں شریک کرتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کو امتِ مسلمہ کے لیے پسندیدہ عمل قرار دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ما عمل ابن آدم يوم النحر عملاً أحب إلى الله من إهراق الدم (11)

قربانی کے دن آدمی کا سب سے پسندیدہ عمل اللہ کے نزدیک خون بہانا ہے

آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود قربانی فرمایا کرتے تھے، اور اپنی امت کے لیے دعائیں بھی کرتے تھے۔ آپ نے ہمیں سکھایا کہ قربانی کے جانوروں کے ساتھ نرمی برتی جائے، انہیں تکلیف نہ دی جائے، اور ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لے کر اخلاص سے یہ عبادت ادا کی جائے۔

دل کی سختی پیدا کرنے والے اعمال کچھ اور ہوتے ہیں: جیسے ظلم، ناانصافی، حسد، غرور، کینہ اور دنیا کی محبت میں اندھا ہو جانا۔ قربانی تو ان سب کے خلاف ایک تربیت ہے، جو ہمیں سکھاتی ہے کہ ہم اپنی چاہت، اپنے مال اور اپنی پسندیدہ چیزوں کو اللہ کے حکم پر قربان کر دیں۔ اس سے دل نرم ہوتا ہے، خدا کا قرب نصیب ہوتا ہے اور نفس کی تربیت ہوتی ہے۔

لہذا قربانی کی روح کو سمجھا جائے تو یہ واضح ہوگا کہ قربانی ہرگز دل کو سخت نہیں کرتی بلکہ یہ دل کی گہرائیوں میں خشیت، نرمی، ایثار اور محبت پیدا کرتی ہے۔ یہ اعتراض کہ "قربانی دل کو سخت کر دیتی ہے" دراصل ایک سطحی فہم کا نتیجہ ہے، جو نہ قرآن و سنت سے مطابقت رکھتا ہے، نہ عقل و فطرت سے، اور نہ ہی معاشرتی حقیقت سے۔ قربانی ایک مکمل تربیتی عمل ہے، جو انسان کو روحانی بلندی، سماجی ہمدردی اور اخلاقی عظمت عطا کرتا ہے۔ :

خلاصہ کلام یہ کہ قربانی محض چند جانوروں کے ذبح کا عمل نہیں، بلکہ یہ ایک ہمہ گیر عبادت ہے جو معاشرے کے محروم طبقات تک نعمتیں پہنچانے کا ذریعہ بنتی ہے۔ اس کے ذریعے ایثار، ہمدردی اور بھائی چارے جیسے قیمتی جذبات کو جِلا ملتی ہے۔ قربانی کا یہ مبارک عمل اسلامی تعلیمات کے عین مطابق، متوازن، فطری اور انسان دوست ہے، جسے سطحی اعتراضات یا محدود ذہنوں کی سوچ متنازع نہیں بنا سکتی۔

آج کا تقاضا ہے کہ ہم اس عظیم شعیرہ کا دفاع محض جذبات کی بنیاد پر نہیں بلکہ علم، حکمت اور سنجیدہ مکالمے کے ذریعے کریں، تاکہ دنیا کو یہ بات بخوبی سمجھائی جا سکے کہ اسلام کا ہر حکم انسانی فطرت، اخلاقی اقدار اور سماجی فلاح کے اصولوں سے ہم آہنگ ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے احکام کے آگے سراپا تسلیم و رضا بننے کی توفیق عطا فرمائے، اور معترضین کو بصیرت، ہدایت اور سلیم العقل عطا فرمائے۔ آمین۔

حوالہ جات:(1)

https://www.tierschutzbund.de/en/animals-topics/animals-in-sport-and-entertainment/bullfighting/?utm

https://ecamaastricht.org/blueandyellow-zoomingin/the-massacre-of-dolphins-in-the-faroe-islands-what-can-the-european-union-do?utm

https://phys.org/news/2020-01-snipers-cull-camels-drought-stricken-australia.html?utm

https://time.com/3977018/cecil-lion-walter-palmer-letter/?utm

https://www.newsweek.com/kapparot-why-thousands-chickens-will-die-israel-today-controversial-religious-1124404?utm

(2)(صحیح مسلم: 1955)

(3)

https://www.scmp.com/news/china/society/article/3106776/chinas-state-media-calls-animal-abuse-be-illegal-after-cat-and?utm

https://www.animallaw.info/sites/default/files/Dog%20Meat%20Trade%20in%20South%20Korea.pdf?utm

https://pmc.ncbi.nlm.nih.gov/articles/PMC10571904/?utm

https://animalequality.org/issues/meat/?utm

(4)الکوثر:2

(5)الحج:37

(6)النحل:5

(7)https://www.who.int

(8)(سورہ الحج:28)

(9)

https://www.arabnews.com/node/1157071/saudi-arabia?utm_source=chatgpt.com

(10)(سورۃ الصافات:102)

(11)(ترمذی حدیث:1493)

علامہ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح قرار دیا (صحیح الجامع:1118)

گناہ کبیرہ اور صغیرہ کا بیان (پہلی قسط)

محمد سعود پوکھریاوی

اسلام میں انسان کو ایک ایسی زندگی گزارنے کا حکم دیا گیا ہے جو اللہ کی رضا کے مطابق ہو۔ انسانی زندگی کی راہ میں گناہ ایک بڑی رکاوٹ ہے جو انسان کے روحانی ارتقا اور اللہ کے قریب جانے میں مانع بنتی ہے۔

گناہ دراصل وہ اعمال ہیں جو انسان کے دل اور ذہن پر منفی اثرات ڈالتے ہیں، اور ان کا ارتکاب انسان کی دینی اور اخلاقی ترقی کو متأثر کرتا ہے اور گناہ انسان کی طرف سے کی جانے والی وہ نافرمانی ہے جو اللہ کی ہدایت کے خلاف ہوتی ہے۔

گناہوں کے اقسام؛

کبائر اور صغائر: دلائل اور نصوص کی روشنی میں؛

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: إِن تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَنُدْخِلْكُم مُّدْخَلًا كَرِيمًا{النساء: ۳۱}

ترجمہ: اگر تم بڑے گناہوں سے بچتے رہو گے جس سے تم کو منع کیا جاتا تو ہم تمہارے چھوٹے گناہ دور کر دیں گے اور عزت و بزرگی کی جگہ داخل کریں گے۔

وقال سبحانه: الَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبَائِرَ الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ إِلَّا اللَّمَمَ [النجم: ۳۲]

ترجمہ: اور ان لوگوں کو جو بڑے گناہوں سے بچتے ہیں اور بے حیائی سے بھی سوائے کسی چھوٹے گناہ کے۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «الصَّلَاةُ الْخَمْسُ، وَالْجُمْعَةُ إِلَى الْجُمْعَةِ، كَفَّارَةٌ لِمَا بَيْنَهُنَّ، مَا لَمْ تُغْشَ الْكَبَائِرُ [مسلم: ۵۵۰]

ترجمہ: ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''پانچوں نمازیں اور ہر جمعہ دوسرے جمعہ تک درمیانی مدت کے گناہوں کا کفارہ (ان کو مٹانے والے) ہیں جب تک کبیرہ گناہوں کا ارتکاب نہ کیا جائے۔''

ولهذا قال ابن القيم رحمه الله: الذنوب تنقسم إلى صغائر وكبائر بنص القران والسنة، واجماع السلف وبالإعتبار۔

اوراسی لیے ابن قیم رحمہ اللہ نے فرمایا : کتاب وسنت کے نصوص ، اجماع سلف اوراعتبار کے لحاظ سے گناہوں کی تقسیم صغائر وکبائر کی طرف ہوتی ہے ۔

[مدارج السالكين : ١/٣٢٤]

گناہ کبیرہ کے دو درجات ہیں؛

پہلا : جو دین اسلام سے خارج کردیتا ہے ، جیسے شرک اکبر ہے یعنی اللہ رب العالمین کے علاوہ دوسرے کو سجدہ کرنا ۔

دوسرا : جواسلام پر باقی رہتا ہے اوراس سے خارج نہیں ہوتا ہے ، جیسے زنا کرنا ، شراب پینا ، چوری کرنا وغیرہ ۔

ابو بکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : عَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ أَبِي بَكْرَةَ، عَنْ أَبِيهِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، قَالَ : قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : «أَلاَ أُنَبِّئُكُمْ بِأَكْبَرِ الكَبَائِرِ؟» ثَلاَثًا، قَالُوا: بَلَى يَا رَسُولَ اللَّهِ، قَالَ: «الإِشْرَاكُ بِاللَّهِ، وَعُقُوقُ الوَالِدَيْنِ - وَجَلَسَ وَكَانَ مُتَّكِئًا فَقَالَ - أَلاَ وَقَوْلُ الزُّورِ»، قَالَ: فَمَا زَالَ يُكَرِّرُهَا حَتَّى قُلْنَا: لَيْتَهُ سَكَتَ

[بخاری : ۲۶۵۴]

ترجمہ : کہ میں تم لوگوں کو سب سے بڑے گناہ کے متعلق نہ بتاوں ؟

تین بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح فرمایا ، صحابہ کرام نے عرض کیا ، ہاں اے اللہ کے رسول ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا ، ماں باپ کی نافرمانی کرنا ، آپ اس وقت ٹیک لگائے ہوئے تھے لیکن اب آپ سیدھے بیٹھ گئے اور فرمایا : ہاں اور جھوٹی گواہی بھی ۔ انہوں نے بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جملے کو اتنی مرتبہ دہرایا کہ ہم کہنے لگے کاش !آپ خاموش ہوجاتے ۔

کبیرہ اور صغیرہ گناہ کے درمیان فرق :

پہلا : تعریف کے اعتبار سے :

ان دونوں کی تعریف میں اختلاف کیا گیا ہے لیکن راجح قول یہ ہے کہ کبیرہ ہر وہ گناہ کو کہتے ہیں جس پر حد قائم ہوچاہے وہ دنیا میں ہویا آخرت میں ۔

اور صغیرہ گناہ یہ ہے کہ دنیا اور آخرت میں اس پر کوئی حد نہ ہو ۔

دوسرا : تعداد کے اعتبار سے ۔

کبیرہ گناہ کی تعداد میں اختلاف ہے۔

1 : ابن مسعود فرماتے ہیں کہ وہ چار ہیں۔

2 : ابن عمر کا کہنا ہے کہ وہ سات ہیں۔

3 : عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے کہ وہ نو ہیں۔

4 : قال سعيد بن زبير سال رجل ابن عباس عن الكبائر أسبع هن؟ قال: هن إلى سبع مائة أقرب، وهذا على سبيل التكثير والمبالغة لا الحصر، ويدل على ذلك قوله: "كل شيء عصي الله به فهو كبيرة " قال الامام ابن ابي العز: فان من قال: سبع، أو سبع عشرة، او إلى السبعين أقرب، مجرد دعوة[شرح الطحاویہ : ۵۲۷]

ترجمہ : سعید بن جبیر کہتے ہیں کہ ایک شخص نے ابن عباس سے کبائر کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے فرمایا کہ کبائر کی تعداد 700 کے قریب ہے۔ یہ تعداد بطور مبالغہ ہے، نہ کہ کسی خاص تعداد کے طور پر۔

اس بات کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا : 'جو بھی چیز اللہ کی نافرمانی ہو، وہ کبیرہ گناہ ہے۔

"امام ابن ابی العز نے فرماتے ہیں کہ جو شخص کہے کہ کبائر سات ہیں یا سترہ یا ستر کے قریب ہیں، تو یہ صرف ایک دعویٰ ہے۔"

صحیح بات یہ ہے کہ کبائر اور صغائر کی کوئی تعداد متعین نہیں ہے۔

تیسرا : حکم کے اعتبار سے.

جو صغیرہ گناہ ہے وہ نماز روزہ وضو صدقہ اور تسبیح وغیرہ سے مٹ جاتے ہیں اور جو کبیرہ گناہ ہے اس کے لیے توبہ شرط ہے یعنی ضروری ہے کہ مرتکب کبیرہ توبہ کرے۔

نیک اعمال سے صغیرہ گناہ کے مٹ جانے کی دلیل :

وَ أَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفَيِ النَّهَارِوَزُلَفًا مِّنَ اللَّيْلِ ۚ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ ۚ ذَٰلِكَ ذِكْرَىٰ لِلذَّاكِرِينَ [ھود : ۱۱۴]

دن کے دونوں سروں میں نماز قائم کرو اور رات کی کئی ساعتوں میں بھی، یقیناً نیکیاں برائیوں کو دور کردیتی ہیں، یہ نصیحت ہے نصیحت پکڑنے والوں کے لئے۔

حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم :

الصَّلَوَاتِ الْخَمْسُ وَالْجُمْعَةُ إِلَى الْجُمْعَةِ وَرَمَضَانُ إِلَى رَمَضَانَ مُكَفِّرَاتٌ لِمَا بَيْنَهُنَّ مَا اجْتُنِبَتِ الْكَبَائِرُ [مسلم : ۲۳۳]

انسان جب تک کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرتا رہے تو پانچوں نمازیں، ہر جمعہ دوسرے جمعے تک اور رمضان دوسرے رمضان تک، درمیانی مدت کے گناہوں کا کفارہ ہے۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی ان شاء اللہ۔

چوتھا: اثر کے اعتبار سے.

جو کبیرہ گناہ کا ارتکاب کرتا ہے وہ عدالت کے دائرے سے خارج ہو کر کے فسق کے دائرے میں چلا جاتا ہے یعنی جو کبیرہ گناہ کرتا ہے اور توبہ نہیں کرتا وہ فاسق ہو جاتا ہے، اس کے برعکس جو صغیرہ گناہ کا ارتکاب کرتا وہ عدالت کے دائرے سے فسق کے دائرے میں نہیں جاتا البتہ اگر وہ اس پر اصرار کرے تو وہ چلا جاتا ہے۔

[شرح العقیدہ السفارینیۃ: ۵۰۶-۵۰۷]

یہ بات ذہن نشین کرنی چاہیے کہ نہ کوئی بڑا گناہ استغفار سے بڑا ہوتا ہے اور نہ کوئی چھوٹا گناہ اصرار سے چھوٹا ہوتا ہے، جیسا کہ امام ابن ابی العزنے فرمایا: تاہم ایک اہم بات ہے جس پر توجہ دینی چاہیے: وہ یہ ہے کہ بڑے گناہ کے ساتھ اگر شرم، خوف اور اس کی عظمت کا احساس ہو، تو وہ اسے چھوٹے گناہوں کے مترادف بنا سکتا ہے، اور اسی طرح چھوٹے گناہ کے ساتھ اگر بے حیائی، بے پرواہی، خوف کا نہ ہو اور اس کو ہلکا سمجھا جائے، تو وہ اس گناہ کو بڑے گناہوں میں شامل کر سکتا ہے۔ یہ معاملہ دل کی حالت پر منحصر ہے، جو صرف عمل تک محدود نہیں ہوتا بلکہ اس میں اضافی احساسات بھی شامل ہوتے ہیں، اور انسان خود اپنی حالت اور دل کی کیفیت سے یہ جان سکتا ہے۔ [شرح الطحاویۃ: ۴۵۱]

عمل سے پہلے عقیدہ کی درستگی ضروری ہے

✍: علامہ نواب صدیق حسن خان رحمہ اللہ (۱۸۹۰ء)

جب کسی شخص کا عقیدہ ہی درست نہیں ' تو اس کے سارے اعمال برباد ہیں، خواہ وہ کتنی ہی عبادت بجالائے، آخرت میں اس عبادت کا اسے کچھ فائدہ نہ ہوگا، اور جس کسی کا عقیدہ درست ہے، اسے عمل قلیل بھی نفع دے گا۔ حدیث میں جن بہتر (۷۲) فرقوں کو ناری اور جہنمی قرار دیا گیا ہے ' وہ سب اہلِ قبلہ ہیں اور عبادت کرتے ہیں، نماز روزہ، زکات اور حج بجا لاتے ہیں، مگر اس فسادِ عقیدہ کی وجہ سے وہی جہنمی ٹھہرے۔

☚ اس لئے یہ بات مقرر ہو چکی ہے کہ انسان عمل سے پہلے عقیدے کی اصلاح کرے اور اسے درست کرے، ورنہ ﴿عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ﴾ [الغاشیۃ: ۳] [محنت کرنے والے تھک جانے والے] کا مصداق بن جائے گا، ساری محنت برباد اور الٹا گناہ لازم آئے گا۔

📚: [مجموعہ رسائل عقیدہ: ۲۰۲/۳]

دینی تعلیم کی اہمیت وافادیت

محمد منظم بھارتی

طالب جامعہ نجران

إِنَّ الْحَمْدَ لِلَّهِ، نَحْمَدُهُ وَنَسْتَعِينُهُ، مَنْ يَهْدِهِ اللَّهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ، وَمَنْ يُضْلِلْ فَلَا هَادِيَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ أَمَّا بَعْدُ فَأَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّحِيمِ ﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ﴾ 28 : فاطر۔

برادران اسلام ! سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ اللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : إِنَّ مِنْ أَشْرَاطِ السَّاعَةِ: أَنْ يُرْفَعَ العِلْمُ وَيَثْبُتَ الجَهْلُ

ترجمہ :- قیامت سے پہلے کچھ ایسے ایام آئیں گے کہ علم اٹھا لیا جائے گا اور جہالت چہار سو پھیل جائے گی (صحيح البخاري : 7063)

آج ہمارے سماج میں اکثر لوگ اپنے بچوں کو دینی تعلیم کے بجائے دنیاوی تعلیم کی طرف بھیجتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ہم نے اس کی اہمیت کو اب تک نہیں سمجھا، واللہ اگر ہم اس کی اہمیت وفضیلت کو جان لیں تو ہر گھر میں حافظ قرآن، عالم دین اور امام وخطیب پیدا ہوں گے ان شاء اللہ، لیکن افسوس کہ ہماری سوچ مادیت پرستی کی طرف ہے'ٹھیک ہے! دنیا کمانا کوئی غلط نہیں، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم اپنے دین کو بھلا بیٹھیں، اللہ ورسول کی باتیں اور اسلام کی بنیادی احکام واصول سے نابلد رہیں۔ یاد رہے کہ اگر ہم اسی طرح دینی تعلیم کو ہلکے میں لیں گے اور معمولی سمجھیں گے تو ہم گرچہ دنیا کی نظر کامیاب ہوں مگر آخرت میں خائب وخاسر ہوں گے۔

مسلم سماج کے والدین پر یہ فرض ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنے ننھے منے بچوں کو دینی تعلیم کی طرف مائل کرائیں، ان کے سامنے اللہ ورسول کی باتیں، انبیاء وصحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے قصے سنائیں اسی طرح چھوٹی چھوٹی دعائیں سکھائیں، تاکہ بچوں کے اندر دین داری سرایت کر جائے۔

افسوس کہ اس کی اہمیت ہمیں اس وقت نظر آتی ہے جب جمعہ کے دن مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھانے کے لیے کوئی خطیب نہیں ملتا، کسی کے انتقال پر جنازہ کی نماز پڑھانے کے لیے کوئی امام نہیں ملتا، نکاح پڑھانے کے لیے کوئی قاضی نہیں ملتا، اس وقت ہمارا ذہن دینی تعلیم کی طرف جاتا ہے، یاد رہے کہ ایک عالم ہزاروں آئی پی ایس، ایم بی بی ایس ڈاکٹر، اسی طرح کے بڑی بڑی ڈگریاں حاصل

کرنے والوں سے لاکھ گنا بہتر ہو سکتا ہے اور بہتر کیوں نہ ہو؟ کیا آپ کی نماز جنازہ پڑھانے کے لیے کوئی آئی پی ایس افسر آتا ہے ، یا ایم بی بی ایس ڈاکٹر؟ ہرگز نہیں! الا یہ کہ ان کے اندر بنیادی دینی تعلیم بھی موجود ہو۔ اگر ہم مسلمانوں کے حالات پر غور کریں تو یہ بات ہمیں اچھی طرح معلوم ہو جائے گی کہ اکثر لوگ دنیاوی امور کو تو بہت اچھے سے جانتے ہیں ، یہ تو جانتے ہیں کہ نیٹ ، کمپیوٹر ، موبائل کا عمدہ سے عمدہ استعمال کیسے ہوگا؟ فیشن کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے ؟

ایک دوسرے سے کسی بھی کام میں آگے کیسے بڑھا جائے ؟

ان پڑھ سے ان پڑھ کیوں نا ہو اس سے سیاست کے تعلق سے پوچھیں تو وہ ایسے بیان کرے گا کہ آپ تصور بھی نہیں کر سکتے ؟ عالمی حالات خبروں سے آگاہ ہوگا مگر "اللہ الصمد" کا کیا معنی ہے ؟ ہمارا دین کیا ہے ؟ ، نماز ، وضو اور غسل کے طریقے کیا ہیں ، ان جیسے بنیادی سوالات کے جوابات میں مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔

یہ تو سماج کے جاہل اور کم پڑھے لکھے لوگوں کی حالت تھی ، دوسری پڑھے لکھے طبقہ کی بات کی جائے یا علماء کی چولی میں جہلاء کی بات کی جائے تو وہ اور قابل افسوس ہے وہ نا جانے کتنوں کو بغیر علم کے غلط فتاوے دے کر خود گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں ، حالانکہ یہ علم سے کوسوں دور ہیں۔

ایسی صورت میں ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم ان لوگوں کے مقابلے میں کھڑے ہو کر صحیح رہنمائی کریں۔ یہ رہنمائی ہم کب کر سکتے ہیں؟ جب ہم دین کے تمام قوانین و ضوابط کو سمجھیں گے ، علم دین کو معروف طریقہ سے سیکھیں گے۔

دینی تعلیم کی افادیت اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتی ہے کہ اسی علم کے ذریعے سے ہم اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچان پاتے ہیں ، محبت رسول اور اتباع رسول کا جذبہ پیدا ہوتا ہے ، حلال و حرام کی تمیز کر پاتے ہیں اور یہ سب علم دین کے سیکھنے سے ہی ممکن ہے۔

قرآن و حدیث میں دینی تعلیم حاصل کرنے کے متعلق بہت تاکید آئی ہے اور اس کی اہمیت و فضیلت کو ہمارے نبی پاک ﷺ نے خوب اجاگر کیا ہے ، دینی تعلیم جہاں نعمت الٰہی ہے وہیں رحمت ربانی بھی ہے ، جہاں ذریعہ برکت ہے تو وہیں باعث نجات اور وجہِ سربلندی ہے ، اصل علم تو دینی تعلیم ہے ،

ہمیں دینی تعلیم کے حصول کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے ، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے جو پہلا لفظ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر پہ نازل فرمایا وہ ''اِقرَأ'' ہے یعنی پڑھیے جس سے علم دین کی اہمیت فضیلت نظر آتی ہے۔

جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ، خَلَقَ الْإِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ، اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ، الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ، عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ

(سورۃ العلق : آیت 1 تا 5)

اے پیغمبر! آپ پڑھیے اپنے رب کے نام سے جس نے (ہر چیز کو) پیدا کیا ہے، (اور) انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا، پڑھیے اور آپ کا پروردگار بڑا کریم ہے، جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا، انسان کو وہ کچھ سکھا دیا جو وہ نہیں جانتا تھا۔

اسی سورہ کے ان ہی پانچ آیات کے ساتھ نزولِ قرآن پاک کا آغاز ہوا، یہ وحی الٰہی کی پہلی آیات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے دینی علم کی اہمیت کو لفظ ''اِقرأ'' لا کر اجاگر کیا، یعنی ہمیں ہر حال میں دینی تعلیم حاصل کرنا ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں :

تَفَقَّهُوا قَبْلَ أَنْ تُسَوَّدُوا. ثم قَالَ الإمامُ البخاري رحمه الله: وَبَعْدَ أَنْ تُسَوَّدُوا، وَقَدْ تَعَلَّمَ أَصْحَابُ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي كِبَرِ سِنِّهِمْ

(صحیح البخاری 129/1)

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ سرداری دی جانے سے پہلے دین کی سمجھ حاصل کرو، اور امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سردار بنائے جانے کے بعد بھی علم حاصل کرو، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم نے بڑھاپے میں بھی دین سیکھا۔

لہٰذا اس سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ علم حاصل کرنا اللہ تعالیٰ کا اول حکم ہے، یہ حقیقت میں مقصد حیات کے ساتھ عزت و شرافت کی ایک مضبوط بنیاد بھی ہے۔

سبحان اللہ! اسی لیے اسلام نے دینی تعلیم کو مسلمانوں کے لیے اختیاری نہیں رکھا بلکہ لازمی قرار دیا ہے چنانچہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: طلبُ العلمِ فریضۃٌ علی کلِّ مسلمٍ (صحیح الجامع : 3914) شرعی علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

یہ تھی چند احادیث مبارکہ جو ہمیں دینی تعلیم کی اہمیت و افادیت بتاتی ہے،

تعلیم کے حصول کے لیے قابل اساتذہ کا ہونا بھی بے حد ضروری ہے جو بچوں کو اعلیٰ تعلیم کے حصول میں مدد کرے۔ رابرٹ فراسٹ نے کیا خوب کہا تھا میں پڑھاتا نہیں جگاتا ہوں I am not a teacher but an awakener مطلب یہ کہ یہی استاد کی بنیادی ذمہ داری ہوتی ہے۔ استاد وہ نہیں جو محض چار کتابیں پڑھا کر اور کچھ کلاسز لے کر اپنے فرائض سے مبرا ہو گیا بلکہ استاد وہ ہے جو طلباء و طالبات کی خفیہ صلاحیتوں کو بیدار کرتا ہے اور انہیں شعور و ادراک، علم و آگہی نیز فکر و نظر کی دولت سے مالا مال کرتا ہے۔

آپ کے جانکاری کے لیے بتادوں کہ دینی مدارس میں دو شعبوں کو بنیادی حیثیت حاصل ہے : شعبۂ تعلیم اور شعبۂ تربیت، تعلیم کی مثال جسم کی سی ہے، جبکہ تربیت روح کی مانند ہے، روح کی اہمیت جسم سے زیادہ ہے، اس کے بغیر جسم مردہ اور بے معنی ہے، اسی طرح تربیت کے بغیر تعلیم ادھوری اور غیر مفید رہتی ہے، تعلیم پھول ہے تو تربیت خوشبو، تعلیم الفاظ ہیں تو تربیت معانی،

اخیر میں اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ، اللہ تعالیٰ ہم سب کو دینی تعلیم حاصل کرنے کی توفیق دے، ساتھ ہی ساتھ طلباء مدارس کی حفاظت فرمائے، (آمین)

اِک معصوم دعا

"مولانا عبدالرؤف رحمانی جھنڈانگری نے اپنے سوانحی واقعات میں اپنے بچپن کے ایک استاد کے بارے میں لکھا ہے:

"بچپن میں ہمارے ایک استاد میاں مالک علی صاحب لٹیاوی تھے۔ہم لوگ ان سے پڑھنے کے وقت ادھر ادھر گھر کے کونوں میں چھپ جایا کرتے تھے۔لیکن ہمیں زبردستی ڈھونڈ نکالا جاتا اور پڑھنے کے لیے مجبور کیا جاتا تھا۔

ایک دن ہم پڑھنے والے ساتھیوں نے مشورہ کیا کہ کیوں نہ دعا کی جائے کہ میاں صاحب مر جائیں!

یہ تجویز سن کر مولانا جھنڈانگری کے چھوٹے بھائی عبدالرحمن نے کہا کہ اگر ہماری دعا سے میاں صاحب مر بھی گئے تو ابا جان دوسرا مدرس لے آئیں گے، لہذا کیوں نہ دعا کی جائے کہ ابا ہی مر جائیں!"

(ساکنان قریہ جاں/ شیخ صلاح الدین مقبول۔ص:41)

امام ذہبی نے سیر اعلام النبلاء میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ خلیفہ معتصم کو بچپن میں جب پڑھنے کے لیے درسگاہ میں بھیجا گیا تو پڑھائی میں اس کا دل بالکل نہیں لگتا تھا اور یہ پڑھنے سے بہت کتراتا تھا۔

ایک دن معتصم کا ایک کلاس فیلو وفات پا گیا تو معتصم کے باپ خلیفہ ہارون نے بیٹے دوست کی وفات پر تعزیت کرتے ہوئے کہا کہ تمھارا دوست فوت ہو گیا ہے!

یہ سن کر معتصم بولا: اچھا ہوا، اس طرح درسگاہ سے تو اس کی جان چھوٹی!

یہ سن کر ہارون الرشید کہنے لگا: بیٹا اگر وہاں جانا اتنا ہی ناپسند ہے تو آج کے بعد تم بھی جانا چھوڑ دو!

(سیر اعلام النبلاء: 10/292)

معاشرے کی اصلاح یہیں سے ممکن ہے

(ہدایت اللہ فارس)

قارئین کرام!

معاشرے کی اصلاح یا اصلاح معاشرہ جیسے الفاظ سے ہمارے کان غیر مانوس نہیں ہیں، یقینا یہ ایک خوبصورت عنوان اور دو لفظوں سے مرکب حسین و دلکش تعبیر ہے۔

معاشرہ کا لفظ سنتے ہی معاشرے کی وہ تمام برائیاں خواہ شرک و بدعات کی شکل میں ہوں یا سود، کرپشن، جوا، شراب نوشی، زناکاری، جھوٹ، جگل خوری، غیبت، جھگڑا فساد اور حق تلفی جیسے قبیح افعال کے کی شکل میں ہوں ذہن و دماغ میں گردش کرنے لگتی ہیں، جن برائیوں نے ہمارے مسلم معاشرے کو گندا اور زہر آلود کر دیا ہے!

ایسا نہیں کہ معاشرے کی اصلاح کے لیے کوششیں نہیں کی گئیں یا نہیں کی جا رہی ہیں بلکہ اس کے لیے بے شمار جماعتیں اور ان گنت ادارے موجود ہیں، نہ جانے کتنی کانفرنس اور اجلاس کا انعقاد خاص اسی مقصد کے تحت ہوتا ہے لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ اتنی ساری جماعتوں اور حلقوں کی ہمہ جہت کوششوں کے باوجود معاشرہ آج بھی انہیں بگاڑ و فساد کے ساتھ سانس لے رہا ہے!

چل چل کے پھٹ چکے ہیں قدم اس کے باوجود
اب تک وہیں کھڑے ہیں جہاں سے چلے تھے ہم

قارئین کرام!

کیا ہم نے غور کیا ہے؟! آخر یہ محنتیں یہ ساری کوششیں بیکار اور اکارت کیوں؟

اصلاح معاشرہ کی کوئی تدبیر کامیاب کیوں نہیں ہو رہی؟!

معاشرہ بجائے اصلاح کے مزید بگاڑ و فساد کی طرف کیوں بڑھ رہا ہے جبکہ قرآن میں اللہ تعالی کا وعدہ موجود ہے کہ:

"والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا"

جو لوگ ہماری راہ میں کوشش کرتے ہیں ہم انہیں راہ راست کی طرف رہنمائی کرتے ہیں!

ظاہر ہے کمی ہمارے اندر ہی موجود ہے، اصلاح معاشرہ کے نام پر کی جانے والی ہماری تدبیروں اور کوششوں کا رخ کہیں نہ کہیں صحیح نہیں ہے، یہ کوششیں ان صفات اور خوبیوں سے آراستہ نہیں ہیں جو دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کر سکیں۔

قارئین کرام!

اگر ہم غور و فکر کے دریچے کو کھولیں، اپنے گریباں میں جھانک کر دیکھیں اور تحقیق کا دائرہ ذرا وسیع کریں تو ہمیں اتنا ضرور معلوم ہو جائے گا کہ اصلاح معاشرہ کے نام پر کی جانے والی کوششوں میں سب سے بڑی خامی اور خرابی جس سے ہم یکسر چشم پوشی سے کام لیتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہمیں اپنی ذات سے پہلے ہر جگہ دوسروں کی اصلاح کی فکر ہوتی ہے!

اصلاح کے نام پر ہماری غالبا ہر تقریر اور تحریر ہماری ہر نصیحت اور ہمارا ہر اجلاس دوسروں کے لیے ہوتا ہے، ہر وقت ہماری خواہش ہوتی ہے کہ معاشرے کے تمام رسوم و بدعات کے خاتمہ کا آغاز دوسروں کے گھر سے شروع ہو، ہر طرح کی تبدیلی کی ابتدا دوسرا کرے!

اس طرح جہاں ہم ایک طرف خود کو اسلام کا مکیں بتاتے ہیں تو دوسری طرف ہم خود ہی عملی طور پر اسلام کے ستونوں اور دیواروں کو کمزور کر رہے ہیں، المیہ یہ کہ ہر برائی کے لیے جواز کا راستہ تلاش کرنا ہمارا شیوہ بن چکا ہے، ہمارا قومی کلچر کیا ہے ہمیں نہیں معلوم، ہماری قوم ثقافت کیا ہے اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں!

دوسروں تک حق بات پہنچانے میں ہم دلچسپی رکھتے ہیں پر فرائض و واجبات پر اپنی ذمہ داریوں کو بھول بیٹھے ہیں۔

یاد رکھیں! اس طرح اصلاح ہر گز ممکن نہیں، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

إِنَّ ٱللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوۡمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُواْ مَا بِأَنفُسِهِمۡۗ

اللہ تعالی کسی قوم کی حالت میں تبدیلی اس وقت تک نہیں لاتا جب تک وہ خود اپنے اندر تبدیلی پیدا نہ کرے (الرعد ۱۱)

قارئین کرام!

اگر ہم انبیاء کرام اور صحابہ و تابعین عظام کی حالات زندگی میں ایک طائرانہ نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اصلاح کے سلسلے میں ان کا طرز عمل آج کے ہمارے طریقۂ کار سے بالکل الگ ہوا کرتا تھا، وہ اصلاح کا آغاز ہمیشہ پہلے اپنی ذات اور اپنے اہل و عیال سے کرتے تھے، انہیں اپنے گھر اور خاندان کی فکر دامن گیر ہوتی تھی، ان کے ہاں اعمال و کردار کے ذریعے دعوت اور اصلاح کا کام ہوتا تھا اور زبانی وعظ و نصیحت کا درجہ دوسرا ہوا کرتا تھا۔

قران مجید نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی خصوصی صفات میں سے یہ بھی بیان کیا ہے:

وَكَانَ يَأۡمُرُ أَهۡلَهُۥ بِٱلصَّلَوٰةِ وَٱلزَّكَوٰةِ

کہ وہ اپنے اہل و عیال کو نماز اور زکوۃ کا حکم دیتے تھے۔

اسی طرح حضرت ابراہیم و یعقوب علیہما السلام کے سلسلے میں قرآن کہتا ہے:

وَوَصَّىٰ بِهَآ إِبۡرَٰهِـۧمُ بَنِيهِ وَيَعۡقُوبُ يَٰبَنِيَّ إِنَّ ٱللَّهَ ٱصۡطَفَىٰ لَكُمُ ٱلدِّينَ فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسۡلِمُونَ

کہ ابراہیم و یعقوب علیہما السلام نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی کہ اے میرے بچو! یقینا اس دین کو اللہ تعالی نے تمہارے لیے منتخب کیا ہے لہذا تم مسلمان ہو کر ہی موت کو گلے لگانا۔ (البقرۃ ۱۳۲)

قارئین کرام!

انبیائے کرام کے اس طرز عمل سے ایک اصولی بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ والدین کا فرض اور اولاد کا حق یہ ہے کہ سب سے پہلے ان کی اصلاح و فلاح کی فکر کی جائے، انہیں توحید کی اہمیت سے آگاہ کی جائے کہ توحید ہی اصل کامیابی کا ضامن ہے، اس کے بغیر کامیابی کا تصور ہی نہیں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: قولوا لا الہ الا اللہ تفلحوا

لوگو! کہو کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود برحق نہیں تم کامیاب ہو جاؤ گے۔

انہیں بتایا جائے کہ زندگی کے تمام گوشے میں اللہ تعالی اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع ضروری ہے، کیونکہ یہ اسی خالق کا حکم ہے جس نے تمہیں اس دنیا میں وجود بخشا، ارشاد ربانی ہے:

قُلۡ أَطِيعُواْ ٱللَّهَ وَٱلرَّسُولَۖ فَإِن تَوَلَّوۡاْ فَإِنَّ ٱللَّهَ لَا يُحِبُّ ٱلۡكَٰفِرِينَ

اے نبی! آپ کہہ دیجیے کہ لوگو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اگر تم اس سے روگردانی کرو گے تو جان لو کہ اللہ تعالی کافروں کو پسند نہیں کرتا۔ (آل عمران ۳۲)

انہیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی اس سنگینی سے متنبہ کیا جائے جسے قرآن مجید نے صاف الفاظ میں بیان کر دیا ہے:

فَلۡيَحۡذَرِ ٱلَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنۡ أَمۡرِهِۦٓ أَن تُصِيبَهُمۡ فِتۡنَةٌ أَوۡ يُصِيبَهُمۡ عَذَابٌ أَلِيمٌ (النور ۶۳)

ساتھ ہی انہیں دین کے بنیادی علوم سے آراستہ کرنا ہر ذمہ دار کے لیے ضروری ہے۔

قارئین کرام!

گھر کا ہر ذمہ دار اگر دل وجان سے اصلاح کا یہ نبوی طریقہ اپنائیں تو یقین جانیں کہ معاشرہ سے دھیرے دھیرے برائیوں کا خاتمہ ہو جائے گا ان شاء اللہ۔

یاد رکھیں! معاشرہ فرد سے بنتا ہے، لہذا فرد کی اصلاح میں ہی معاشرہ کی اصلاح مضمر ہے۔

اللہ تعالی نے اپنے کلام پاک میں اسی تنظیمی اصول کے پیش نظر یہ اعلان فرمایا:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ قُوٓاْ أَنفُسَكُمۡ وَأَهۡلِيكُمۡ نَارٗا

اے ایمان والو! تم اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو جہنم کی آگ سے بچاؤ (التحریم ٦)

دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

وَأۡمُرۡ أَهۡلَكَ بِٱلصَّلَوٰةِ وَٱصۡطَبِرۡ عَلَيۡهَاۖ

اپنے اہل وعیال کو نماز کا حکم کیجیے اور خود بھی اس کے پابند رہیے۔ (طہ : ۱۳۲)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جو ساری دنیا کے رسول ہیں اور جن کی ہدایت قیامت تک آنے والی نسلوں کے لیے ہے ان کو بھی سب سے پہلے اسی کا حکم دیا گیا کہ:

وأنذر عشیرتک الأقربین

کہ اپنے رشتہ داروں کو اللہ کے عذاب سے ڈرائیے

اس کے علاوہ مزید چند امور کی طرف اشارہ کرنا مناسب سمجھتا ہوں جو صلاح معاشرہ کے لیے کارامد ثابت ہوں گے جیسے علاقائی سطح پر والدین کی فطری تربیت کی جائے کہ ان کی گود اور آغوش بچوں کے لیے بنیاد اور اساس ہے۔

اسی طرح مساجد کو اس کا حقیقی مقام دیا جائے، بچوں کے لیے مکاتب کھولے جائیں تاکہ ان کی صحیح تربیت ہو سکے، اور دین کی بنیادی تعلیم سے مزین ہو سکے۔

اگر ہمارے معاشرے میں اصلاح کا یہی طرز اپنایا جائے، ہمارے واعظین، مقررین، مصلحین وقائدین اور نوجوان طبقہ جو معاشرے میں ریڑ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں اس میدان میں اخلاص کے ساتھ آگے آئیں اور اصلاح کے ہر کام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے متوجہ ہو جائیں تو ان شاء اللہ جلد ہی معاشرہ میں تبدیلی آنے لگیں گی ہمارا معاشرہ چین وسکون کا گہوارہ بن جائے گا اور حقیقی اسلامی معاشرہ کہلانے کا مصداق بن جائے گا

اخیر میں اس شعر کے ساتھ قلم بند کرنا چاہتا ہوں کہ

یہ حوصلہ بھی عطا کر مجھے خدائے کریم

کہ اپنے آپ کو آئینہ دکھاؤں میں

عزیزو!

یہ علم شرعی جو تم حاصل کر رہے ہو، یہ تمھیں تواضع، عاجزی، انکساری، استغنا، عفت، شرافت، پاکیزگی، نیک نفسی، احترام باہم، فکر آخرت، دنیا بیزاری، لذت آشنائی سکھاتا ہے، اگر یہ عناصر تمھارے اندر جگہ پا رہے ہیں تو سمجھو رخ صحیح ہے اور علم نبوت تم پر اپنا اثر ظاہر کر رہا ہے، لیکن اس کے برعکس تمھارے اندر تکبر، عجب، دوسروں کو حقیر سمجھنا، دنیا پرستی، آخرت بیزاری، مفاد پرستی، خود پرستی، خود نمائی جیسے مذموم عناصر پنپ رہے ہیں تو سمجھو علم کا کوئی اثر اور فائدہ تمھاری ذاتی زندگی میں نہیں ہو رہا، اس کی خاطر تمھیں اپنا احتساب کرنے کی ضرورت ہے، تنہائی میں بیٹھ کر سوچنے کی ضرورت ہے کہ آخر یہ علم کیوں میرے اندر مطلوبہ صفات پیدا نہیں کر پا رہا، بلکہ اس کے متضاد عناصر ذہن و دماغ میں کیوں پنپ رہے ہیں، اگر تم احتساب کے اس مرحلہ تک پہونچ گئے تو سمجھو ایک اہم مرحلہ طے کر لیا، ان کوششوں کے ساتھ "علم نافع" کے لیے ہمیشہ دعا کرتے رہو کہ علم، نافع نہ ہو، خود کی تربیت نہ کر سکے، تو وہ علم تمھارے لیے وبال ہے.

شیخ راشد حسن مبارکپوری

جامعہ اسلامیہ فیض عام مئو

موقف السلف من الخوض فيما شجر بين الصحابة

شكيب الرحمن عبدالكريم خان الهندي

(الطالب: بكلية الشريعة وأصول الدين بجامعة نجران)

لقد جعل الله لرسوله أتباعا على دينه، وأنصارا على إقامة شرعه، ودعاة إلى دينه، شرفهم الله بالصحبة والإيمان، وكرمهم بالجنة والرضوان، هم أمناؤه على وحيه، وما عسى مدحي لهم أن يبلغ النزر القليل من شكرهم، أو الثناء على سيرهم، وقد مدحهم من هو بهم عليم خبير، فقال تعالى:﴿**وَٱلسَّٰبِقُونَ ٱلْأَوَّلُونَ مِنَ ٱلْمُهَٰجِرِينَ وَٱلْأَنصَارِ وَٱلَّذِينَ ٱتَّبَعُوهُم بِإِحْسَٰنٍ رَّضِىَ ٱللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا۟ عَنْهُ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّٰتٍ تَجْرِى تَحْتَهَا ٱلْأَنْهَٰرُ خَٰلِدِينَ فِيهَآ أَبَدًا ۚ ذَٰلِكَ ٱلْفَوْزُ ٱلْعَظِيمُ**﴾ [التوبة ١٠٠]وقال: ﴿**لَّقَدْ رَضِىَ ٱللَّهُ عَنِ ٱلْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ ٱلشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِى قُلُوبِهِمْ فَأَنزَلَ ٱلسَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَٰبَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا ﴿١٨﴾** [الفتح :١٨]وقال: ﴿**مُّحَمَّدٌ رَّسُولُ ٱللَّهِ ۚ وَٱلَّذِينَ مَعَهُۥٓ أَشِدَّآءُ عَلَى ٱلْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ۖ تَرَىٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ ٱللَّهِ وَرِضْوَٰنًا ۖ سِيمَاهُمْ فِى وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ ٱلسُّجُودِ ۚ ذَٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِى ٱلتَّوْرَىٰةِ ۚ وَمَثَلُهُمْ فِى ٱلْإِنجِيلِ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْـَٔهُۥ فَـَٔازَرَهُۥ فَٱسْتَغْلَظَ فَٱسْتَوَىٰ عَلَىٰ سُوقِهِۦ يُعْجِبُ ٱلزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ ٱلْكُفَّارَ ۗ وَعَدَ ٱللَّهُ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَعَمِلُوا۟ ٱلصَّٰلِحَٰتِ مِنْهُم مَّغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًۢا ﴿٢٩﴾**﴾ [الفتح: ٢٩]

وعن عمران بن حصين رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: **خيرُ القرونِ قرْني، ثمَّ الَّذين يلونَهم، ثمَّ الَّذين يلونَهم، ثمَّ يأتي قومٌ يشهدون ولا يُستشهدونَ، وينذُرون ولا يوفونَ، ويظهرُ فيهم السِّمَنُ . (البخاري: ٣٦٥٠)**

وهم مع هذا كله بشر غير معصومين من الخطأ والزلل، والوقوع في الفتن والاختلاف، في حياة النبي صلى الله عليه وسلم وبعد مماته، وهذا ما دلت عليه الآثار. ومع هذا فقد أصبح اختلاف الصحابة رضي الله عنهم وما جرى بينهم فتنة لطوائف من الناس حيث ضخمت الأحداث وصورت على غير الوجه الصحيح، زيادة ونقصانا، كذبا وتحريفا، جرحا وتعديلا، مدحا وذما، مما حدا بأهل السنة والجماعة، وهم المعتصمون بالكتاب والسنة، -وهم أهل الإنصاف والعدل، وتحري الحق- ، وأعلم الناس بصحابة رسول الله صلى الله عليه وسلم وما لهم من الفضل وعلو المنزلة في الإسلام أن يقرروا اعتقادهم فيما جرى بين الصحابة رضي الله عنهم من الخلاف بالإمساك عن الخوض فيما شجر بينهم، وحبهم والترضي عنهم، وأذاعوا ذلك وسطروه في كتبهم: في علم الحديث ومصطلحاته، والفقه وأصوله، والعقائد، وتراجم الصحابة رضي الله عنهم وكتب التاريخ۔

ولما رأيت أن الأمر في هذا الأصل العظيم، يكاد يخفى على بعض الناس أو لا يفهم، أردت أن أبين، **(موقف السلف من الخوض فيما شجر بين الصحابة رضي الله عنهم)**، والنقل عنهم في هذه المسألة، ومن تبعهم من العلماء على اختلاف الأعصار والأمصار، مع بيان المنهج الحق في ذلك.

موقف السلف من الخوض فيما شجر بين الصحابة رضي الله عنهم:

من أصول معتقد السلف الصالح في الصحابة عدم الخوض فيما شجر بينهم رضي الله عنهم،

وشاهد هذا : الأحاديث التي فيها النهي عن سب الصحابة رضي الله عنهم.

فعن أنس بن مالك رضي الله عنه قال: **كان بين خالد بن الوليد وبين عبدالرحمن بن عوف، كلام، فقال خالد لعبدالرحمن: تستطيلون علينا بأيام سبقتمونا بها! فبلغنا أن ذلك ذكر للنبي صلى الله عليه وسلم، فقال: دعوا لي أصحابي، فوالذي نفسي بيده، لو أنفقتم مثل أحد-أو مثل الجبال- ذهبا، ما بلغتم أعمالهم.**(رواه الإمام أحمد في مسنده، ٣١٩/٢١، ح/١٣٨١٢، صحيح)

وعن عبدالله بن مسعود رضي الله عنه قال:قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: **إذا ذكر أصحابي، فأمسكوا، وإذا ذكر النجوم، فأمسكوا، وإذا ذكر القدر، فأمسكوا.**(رواه الطبراني في معجم الكبير، ١٩٨/١٠، وذكر الإمام الألباني في السلسلة الصحيحة، ٨٥/١، ح:٣٤)

وعن هشام بن عروة عن أبيه قال: قالت لي عائشة رضي الله عنها: **يا ابن أختي أمروا أن يستغفروا لأصحاب النبي صلى الله عليه وسلم، فسبوهم.** (صحيح مسلم، ح:١٥)

وعن نسير بن دعلوق قال: سمعت ابن عمر رضي الله عنهما يقول: **لا تسبوا أصحاب محمد فلمقام أحدهم ساعة خير من عمل أحدكم عمره.** (سنن ابن ماجه، ح:١٦٢، صحيح)

وهذه أقوال لعلماء أهل السنة والجماعة، تبين بجلاء موقف السلف الصالح من مسألة: الخوض فيما شجر بين الصحابة رضي الله عنهم:

سئل عمر بن عبد العزيز رحمه الله (ت١٠١هـ) **عن القتال الذي حصل بين الصحابة رضي الله عنهم فقال: تلك دماء كف الله يدي عنها، و أنا أكره أن أغمس لساني فيها.** (الطبقات الكبرى لابن سعد، ١٩٧/٥)

وقال سفيان بن عيينة رحمه الله (ت١٩٨هـ): **من نطق في أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم بكلمة فهو صاحب هوى.** (شرح السنة للإمام البربهاري،ص/٥٥، بتحقيق الجميزي)

نقل الإمام اللالكائي رحمه الله اعتقاد الإمام علي بن المديني رحمه الله (ت٢٣٤هـ) ومن أدركه من جماعة السلف وفيه : **ومن تنقص أحدا من أصحاب رسول الله، أو بغضه لحدث كان منه، أو ذكر مساوئه فهو مبتدع حتى ترحم عليهم جميعا فيكون قلبه لهم سليما.** (شرح أصول اعتقاد أهل السنة والجماعة، للإمام اللالكائي، ١٦٩/١)

وقال الإمام أبو زرعة الرازي رحمه الله (ت٢٦٤هـ) : **إذا رأيت الرجل ينتقص أحدا من أصحاب رسول الله فاعلم أنه زنديق، وذلك أن رسول الله عندنا حق، والقرآن حق، و إنما أدى إلينا هذا القرآن والسنن أصحاب رسول الله، و إنما يريدون أن يجرحوا شهودنا، ليبطلوا الكتاب والسنة، والجرح لهم أولى، وهم زنادقة.** (الكفاية في معرفة أصول علم الرواية، ١٨٨/١)

فالصحابة رضي الله عنهم خيار أهل الأرض بعد الرسول، وهم أئمة الدين وأهل الإسلام، فيمسك عن الخوض فيما شجر بينهم،

قال الإمام البربهاري رحمه الله (ت٣٢٩هـ): ..... **واعلم أنه من تناول أحدا من أصحاب محمد فاعلم أنه إنما أراد محمدا، وقد آذاه في قبره.** (شرح السنة، للإمام البربهاري، ص: ١٢٠)

وقال الإمام النووي رحمه الله (ت٦٧٦هـ) : **ومذهب أهل السنة والحق إحسان الظن بهم، والإمساك عما شجر بينهم وتأويل قتالهم وأنهم مجتهدون متأولون لم يقصدوا معصية ولا محض الدنيا، بل اعتقد كل فريق أنه المحق،**

ومخالفة باغ فوجب عليه قتاله ليرجع إلى الله، وكان بعضهم مصيبا وبعضهم مخطئا معذورا في الخطأ لأنه اجتهاد، والمجتهد إذا أخطأ لا إثم عليه. (شرح صحيح مسلم للنووي، ٢١٩/٨)

وقد نقل أبو الحسين محمد بن أحمد الملطي الشافعي رحمه الله (ت٣٧٧هـ) إجماع علماء أهل السنة على الكف عما شجر بينهم ضمن مجموعة من العقائد، فقال: **أصول السنة مما اجتمع عليه الفقهاء والعلماء.... كلهم يقولون:.... الكف عن أصحاب محمد.** (التنبيه والرد على أهل الأهواء والبدع، ص: ٢٥-٢٦)

قال شيخ الإسلام ابن تيمية رحمه الله (ت٧٢٨هـ) عن موقف أهل السنة من الخوض فيما شجر بين الصحابة رضي الله عنهم: **كان من مذهب أهل السنة الإمساك عما شجر بين الصحابة، فإنه قد تثبت فضائلهم، ووجبت موالاتهم ومحبتهم وما وقع منه ما يكون لهم فيه عذر يخفى على الإنسان، ومنه ما تاب صاحبه منه، ومنه ما يكون مغفورا، فالخوض فيما شجر يوقع في نفوس كثير من الناس بعضا وذما، ويكون هو في ذلك مخطئا، بل عاصيا فيضر نفسه، ومن خاض معه في ذلك كما جرى لأكثر من تكلم في ذلك فإنهم تكلموا بكلام لا يحبه الله ولا رسوله، إما من ذم من لا يستحق الذم، وإما من مدح أمور لا تستحق المدح، ولهذا كان الإمساك طريقة أفاضل السلف.** (منهاج السنة، ٤٤٨/٤)

وقال الحافظ ابن حجر العسقلاني رحمه الله (ت٨٥٢هـ) : **و اتفق أهل السنة على وجوب منع الطعن على أحد من الصحابة بسبب ما وقع لهم من ذلك ولو عرف المحق منهم لأنهم لم يقاتلوا في تلك الحروب إلا عن اجتهاد، وقد عفا الله تعالى عن المخطئ في الاجتهاد، بل ثبت أنه يؤجر أجرا واحدا، وأن المصيب يؤجر أجرين.** (فتح الباري بشرح صحيح البخاري لابن حجر العسقلاني، ٣٧/١٣)

موقف السلف من الروايات والأخبار التي خاضت فيما شجر بين الصحابة رضي الله عنهم:

ومن هنا أنقل بعض أقوال العلماء في الموقف من الروايات والأخبار التي خاضت فيما شجر بين الصحابة رضي الله عنهم، والتي كانت بعد ذلك وسيلة للطعن في الصحابة في إيمانهم وصدق إسلامهم،

ومن أبرز هذه الجهات التي استفادت من هذه الروايات للطعن في الصحابة: الرافضة والمستشرقون ومن دار في فلكها،

قال ابن العربي المالكي رحمه الله (ت٥٤٣هـ) : **اقبلوا الوصية، ولا تلتفتوا إلا إلى ما صح من الأخبار، واجتنبوا-كما ذكرت لكم- أهل التواريخ، فإنهم ذكروا عن السلف أخبارا صحيحية يسير، ليتوسلوا بذلك إلى رواية الأباطيل، فيقذفوا-كما قدمنا- في قلوب الناس ما لا يرضاه الله تعالى، وليحتقروا السلف ويهونوا الدين، وهو أعز من ذلك وهم أكرم منا، فرضي الله عن جميعهم،**

ومن نظر إلى أفعال الصحابة تبين منها بطلان هذه الهتوك التي يختلق أهل التواريخ فيدسونها في قلوب الضعفاء. (العواصم من القواصم لابن العربي، ص: ٣٥٠)

فهذا تحذير من ابن العربي رحمه الله من كتب التاريخ لما فيه من خلط الحق القليل بالباطل الكبير،

قال ابن الصلاح رحمه الله (ت٦٤٣هـ) عند كلامه علم معرفة الصحابة في معرض كلامه عن كتاب ابن عبدالبر رحمه الله (الاستيعاب) : **هذا علم كبير، قد ألف الناس فيه كتبا كثيرة ومن أجلها و أكثرها فوائد كتاب الاستيعاب لابن عبدالبر،**

لولا ما شانه به من إيراده كثيرا مما شجر بين الصحابة وحكاياته عن الإخباريين لا المحدثين، وغالب على الإخباريين الإكثاروالتخليط فيما يروونه. (مقدمة ابن الصلاح في علوم الحديث، ص:١٤٧)

والشاهد من كلام ابن الصلاح رحمه الله أن الغالب على الإخباريين الإكثار والتخليط فيما يروونه، ومن يقرأ كتب التواريخ يجد عجبا لا ينقضي من تحريف هؤلاء الرواة لأخبار الصحابة، وخاصة في الفتن والحروب التي وقعت بينهم، مما جعل أهل السنة والجماعة يحذرون من الخوض فيما شجر بينهم،

وقال الحافظ الذهبي رحمه الله (ت٧٤٨ھ) : **كما تقرر الكف عن كثير مما شجر بينهم وقتالهم رضي الله عنهم أجمعين، وما زال يمربنا ذلك (يعني أخبارورو ايات ما شجربين الصحابة رضي الله عنهم) في الدواوين والكتب والأجزاء، ولكن أكثر ذلك منقطع وضعيف، وبعضه كذب....فينبغي طيه وإخفاؤه بل إعدامه لتصفو القلوب، وتتوفر على حب الصحابة الترضي عنهم.** (سير أعلام النبلاء للذهبي، ٩٢/١٠)

وفي موضع آخر يقول: **فأما ما تنقله الر افضة وأهل البدع في كتبهم من ذلك، فلا نعرج عليه، ولا كرامه فأكثره باطل وكذب و افتراء، فدأب الرو افض رو اية الأباطيل، أو رد ما في الصحاح والمسانيد.** (سير أعلام النبلاء للذهبي، ٩٣/١٠)

ومع كثرة هذه الروايات والأخبار التي خاضت فيما شجر بين الصحابة إلا أن أكثرها لا يصح أو من رواية الكذبة والرافضة، ومن يطالع كتاب تاريخ الطبري وما فيه من الكلام على ما شجر بين الصحابة رضي الله عنهم يجد مصداق ما قاله الذهبي رحمه الله من أن أكثر الروايات ضعيف أو منقطع، أو من رواية الرافضة،

وفي هذه الأزمنة المتأخرة قام بعض الباحثين والعلماء بدراسة هذه المرحلة من تاريخ الصحابة وما جرى في أزمنتهم من فتن وحروب بعد فتنة مقتل عثمان رضي الله عنه، خرجت بنتائج طيبة في الدفاع عن الصحابة والذب عن أعراضهم وصدق إيمانهم،

و بالحكم على أسانيد هذه الروايات والأخبار التي نقلت وخاضت فيما شجر بين الصحابة رضي الله عنهم، وأن أكثرها ضعيف ومنقطع وكذب لا يصح كما ذكر ذلك العلماء المتقدمون،

وقال الدكتور حامد محمد الخليفة: **إن مذهب أهل السنة والجماعة هو الإمساك عما شجر في بعض الفترات بين أصحاب النبي، وذلك صفحا عن الأخبار التي دونها أكثر المؤرخين بما رووه عن أعداء الصحابة الذين كانوا يكتبون الكتب المزورة على ألسنة الصحابة منذ عصر عثمان وعلي رضي الله عنهما،**

وواصل خلف أعداء الصحابة ما بدأه أجدادهم في إختلاق الأخبار وتلفيق التهم، حتى لم يعد بين الأيدي كتاب واحد من كتب التاريخ نقيا من رو ايات الإفك والبهتان على الصحابة رضي الله عنهم إلا ما رحم الله، فمن كان من الكتاب سليم النية فإنه يقع في الشراك التي نصبها المغرضون، وبثوها في عامة كتب التاريخ والأدب وغيرها،

ولهذا أوصى سلف هذه الأمة بالإمساك عما شجر بين الصحابة رضي الله عنهم لأننا لا نسأل عن ذلك، لكن إذا ظهر مبتدع أو زنديق يقدح فيهم بالباطل فلا بد من الذب عنهم، وإظهار فضائلهم، وذكر ما يبطل حجته بعلم وعدل، حرصا على سلامة العقيدة، ومكانة حملتها في نفوس المؤمنين،

وأن الإمساك عما شجر بينهم هو الأفضل، إلا إذا كان ذلك للدفاع عنهم، في اثبات الحق ورد الشبهات، ونشر الفضائل المطويات. (الإنصاف فيما وقع في العصر الراشدي من الخلاف للدكتور حامد الخلفية، ص:٣١-٣٥)

وبهذا يتبين لنا أن الروايات والأخبار التي دونت في كتب التاريخ وأرخت وخاضت فيما شجر بين الصحابة رضي الله عنهم لا يمكن الأخذ بها لضعفها أو كذبها،

وأن ما جرى بين الصحابة من خلاف قد زيد فيه وضخم وغير عن وجهه الصحيح لمآرب في نفوس بعض أعداء الصحابة من الرافضة وغيرهم، وأن السلامة في الإمساك عن الخوض فيما شجر بين الصحابة رضي الله عنهم.

موقف السلف من القراءة والبحث والتأليف فيما شجر بين الصحابة رضي الله عنهم:

هذا جزء مهم له صلة بموقف السلف من الخوض فيما شجر بين الصحابة، وأفرد لتسليط الضوء على الموقف من قراءة وتأليف الكتب والبحوث فيما شجر بين الصحابة، وهو داخل ضمن ما نهى عنه علماء أهل السنة والجماعة، وأنه مزلة أفهام، ومعترك أقران، وقل من يخرج من هذه الفتنة وهو سليم القلب لصحابة رسول الله الذين هم خير الناس، وأعلى منزلة بعد الرسل عليهم السلام، أو أنه مما يسمح بقراءته والبحث والتأليف فيه؟

سئل الإمام أحمد بن حنبل رحمه الله (ت٢٤١ھ) **فقيل له: هذه الأحاديث التي رويت في أصحاب النبي ترى لأحد أن يكتبها؟ قال: لا أرى لأحد أن يكتب منها شيئا،**

فقيل له: فإذا رأينا الرجل يطلبها ويسأل عنها-فيها ذكر عثمان وعلي ومعاوية وغيرهم من أصحاب النبي؟

قال: إذا رأيت الرجل يطلب هذه ويجمعها فأخاف أن يكون له خبيئة سوء. (السنة لأبي بكر الخلال، ٥٠٨/٣)

وقال ابن بطة العكبري رحمه الله (ت٣٨٧ھ) بعد تقريره لأصل معتقد أهل السنة والجماعة في الصحابة وما شجر بينهم: **ولا ينظر في كتاب صفين والجمل** (وهما لسيف بن عمر الضبي الأسدي (ت٢٠٠ھ) وقد نقل منه ابن جرير الطبري رحمه الله كثيرا في تاريخه) **ووقعة الدار، وسائر المنازعات التي جرت بينهم (يعني الصحابة) ولا تكتبه لنفسك ولا لغيرك ولا تروه عن أحد ولا تقرأه على غيرك ولا تسمعه ممن يرويه، فعلى ذلك اتفق سادات علماء هذه الأمة من النهي عمل وصفناه.** (الشرح والإبانة لابن بطة، ٢٦٩)

وقال الخطابي رحمه الله (ت٣٨٨ھ) : **وأما ما شجر بين الصحابة وحدث في زمانهم من اختلاف الآراء فإنه من باب كلما قل التسرع فيه والبحث عنه كان أولى بناء وأسلم،...والمباحثة عنهم اقتحام فيما لا يعنينا.**(العزلة، ص:٢٣)

أن علماء أهل السنة والجماعة يقولون بعدم الخوض فيما شجر بين الصحابة رضي الله عنهم، ولو كان قراءة أو بحثا أو تأليفا لما يترتب على ذلك من مفاسد، وتغير القلب على صحابة رسول الله كما يوجب رد الحق الواجب تجاههم، ورد ما معهم من الحق الذي نقلوه عن الرسول، إذ هم نقلة الشرع، كما أن ذلك يفضي بالمسلمين إلى التفرق والتقاتل المنهي عنه،

لا يعني منه أهل السنة والجماعة من الخوض فيما شجر بين الصحابة، عدم ذكر ما حصل بين الصحابة في وقعة الجمل وصفين، فإن ما حصل بين الصحابة قد ذكره الرسول، بل قد بين المصيب من الفريقين كما في دواوين السنة وكتب التاريخ، والبحث لا يحتمل ذكره هنا،

كما أنه لا بد من التفريق بين الدراسة الموضوعية لهذه الأحداث وبين جمع الروايات والخوض بالباطل بالقدح والذم لبعض الصحابة أو كلهم، كما يفعله أهل الأهواء والبدع من الرافضة وغيرهم،

وأن دراسة ما حصل بين الصحابة بعدل وإنصاف مأمور به شرعا،

بل يجب على المسلمين وخاصة العلماء نشر مناقب الصحابة، وبيان منزلتهم التي أكرمهم الله بها،

قال الحافظ الخطيب البغدادي رحمه الله: **فلزم الناقلين للأخبار والمتخصصين بحمل الآثار، نشر مناقب الصحابة الكرام، وإظهار منزلتهم وحملهم من الإسلام عند ظهور هذا الأمر العظيم والخطب الجسيم، واستعلاء الحائدين عن سلوك الطريق المستقيم، ليهلك من هلك عن بينة ويحيا من حي عن بينة، وإن الله لسميع عليم.** (الجامع لأخلاق الراوي وآداب السامع، ۱۱۷/۲)

اعتذار السلف عما شجر بين الصحابة رضي الله عنهم:

لقد كان السلف الصالح، أهل صدق وعدل، وإنصاف يستمدونه من إيمانهم بكتاب الله وسنة رسوله، إضافة لعلمهم بالأخبار والروايات، وبعلم الجرح والتعديل، ورواة الأخبار، ومقاصد أعداء الدين في تأليف الأخبار والروايات، والقصص عن الصحابة وخاصة فيما شجر بينهم من خلاف، وهم مع كل هذا لا ينكرون حقيقة ما شجر بين الصحابة، إلا أنهم يجزمون بأن ما صح من روايات وأخبار الخلاف بين الصحابة رضي الله عنهم قليل في جنب كثير باطل، وأنه قد زيد فيه ونقص، وحرف عن وجهه وحقيقته،

وأن ما وقع إنما كان من اجتهاد من الصحابة، ولم يكن هناك تعمد منهم، للقتال والفساد، بإراقة الدماء وتفريق الأمة.

قال أبو الحسن الأشعري رحمه الله (ت۳۲٤ھ) : **فأما ما جرى بين علي والزبير وعائشة رضي الله عنهم أجمعين، فإنما كان على تأويل واجتهاد، وعلي الإمام، وكلهم من أهل الاجتهاد،**

وقد شهد لهم النبي بالجنة والشهادة، فدل على أنهم كانوا على حق في اجتهادهم،

وكذلك ما جرى بين علي ومعاوية رضي الله عنهما كان على تأويل واجتهاد، وكل الصحابة أئمة مأمونون غير متهمين في الدين، وقد أثنى الله ورسوله على جميعهم، وتعبدنا بتوقيرهم وتعظيمهم وموالاتهم والتبري من كل من ينقص أحدا منهم، رضي الله عنهم أجمعين. (الإبانة عن أصول الدين لأبي الحسن الأشعري، ص:۱۷۸)

وقال أبو زيد القيرواني رحمه الله (ت۳۸۷ھ) في رسالته: **وأن لا يذكر أحد من صحابة الرسول إلا بأحسن ذكر، والإمساك عما شجر بينهم، وأنهم أحق الناس أن يلتمس لهم المخارج ويظن بهم أحسن المذاهب.** (رسالة أبي زيد القيرواني، ص:۲۲)

وقال القرطبي رحمه الله (ت٦۷۱ھ) : **ولا يجوز أن ينسب إلى أحد من الصحابة خطأ مقطوع به، إذ كانوا كلهم اجتهدوا فيما فعلوه، وأرادوا الله عزوجل، وهم كلهم لنا أئمة، وقد تعبدنا بالكف عما شجر بينهم، وألا نذكرهم إلا بأحسن الذكر، لحرمة الصحبة، ولنهي النبي عن سبهم، وأن الله قد غفر لهم، وأخبرنا بالرضا عنهم.** (الجامع لأحكام القرآن للقرطبي، ۳۲۸/۱۹)

وبهذا يتبين لنا موقف السلف من الخوض فيما شجر بينهم، وأنهم أهل إنصاف وعدل، ولهذا اعتذروا عما حصل بين الصحابة، من الخلاف والتقاتل، وأنه إنما حصل باجتهاد وتأويل فرضي الله عن صحابة رسول الله وأرضاهم.وجعلنا الله وإياهم.

المقاصد الشرعية من الإمساك عن الخوض فيما شجر بين الصحابة رضي الله عنهم:

(1) السمع والطاعة لرسول الله صلى الله عليه وسلم حيث أمر بالإمساك عن سب صحابته ومعرفة فضلهم،

(2) حفظ رسول الله وإكرام بمعرفة حقوق صحابته وإكرامهم،

(3) أن في الإمساك عن الخوض فيما شجر بين الصحابة رضي الله عنهم، إكراما للصحابة ومجازاة لهم بالحسنى لما لهم من أيادي بالخير مبسوطة وجهود مشكورة لتبليغهم هذا الدين غضا طريا كما أنزل على الرسول، إذ هم نقلة الشريعة،

(4) أن في الخوض فيما شجر بين الصحابة رضي الله عنهم فتح باب فتنة للمسلمين، وتشويه سمعة للإسلام،

(5) أن في الإمساك عن الخوض فيما جرى بين الصحابة منها لأهل الزندقة والفجور من الولوج لإفساد تعاليم الدين أو تفريق المسلمين،

(6) أن الكلام فيما شجر بين الصحابة يفرق المسلمين إلى فرق وأحزاب، ويضعف المسلمين أمام أعداء الدين،

(7) أن الكلام فيما جرى بينهم يؤدى إلى رمي الصحابة بما هم منه براء، من النفاق والفسق والكفر والشرك، فضلا عن سيئ الأخلاق،

(8) أن فيما حصل بين الصحابة امتحانا لإيمان من يتبع الرسول، وممن ينقلب على عقبيه كحال الخوارج والرافضة، الذين سبوا الصحابة، وبدعوهم وفسقوهم وكفروهم -والعياذ بالله-

(9) أن فيه إغلاقا لباب الكذب على أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم إذ إن أكثر ما يروى كذب، والصدق فيه هم معذورون،

(10) أن الكلام فيهم يفتح باب الطعن في القرآن والسنة من ناحية أن الوارد في الشرع الثناء عليهم، وهذا مخالف لذلك فترك الكلام في ذلك إغلاق لهذا الباب.

الخلاصة:

إن موقف السلف الصالح و معتقدهم فيما شجر بين الصحابة رضي الله عنهم هو الإمساك وعدم الخوض فيما شجر، ومعرفة حق الصحابة رضي الله عنهم من الحب والتقدير، والإكرام والترضي عنهم، فهم أصحاب رسول الله والمبلغون عنه، وحماة الدين،

وقد بين السلف الصالح رحمهم الله جميعا ذلك وسطروه في كتبهم،

مَبعث العجب ومُثير الحيرة : الصخور...!

عبدالقادر بن مطيع الرحمن السلفي

أيها القارئ اللبيب..! واللهِ كلما أرى مثلَ هذه الصخورِ باعثة العجب، المدهشِ وضعُها، المحير منظرُها، أتحير وأستَغرِبُ بغاية الحيرةِ و الغرابةِ. يا ترى صخور فادحة الثقيل هائلة الضخيم وهي منتصبة على سافلها القليل الضيق.!! حتى لايبدو ما عليه قائمة ،وبالإضافة إلى ذلك،هي على صخور متدحرجة أخرى. فلزاما يَفيضُ العقلُ بعِدَّة أسئلة، مثل: من وضعَها هكذا،؟ ومتى وضعها،؟ ومنذ متى هي على حالها الراهنة..؟! تاالله العقلُ يَتحيَّر فيسألُ ثم ينقلب حسيرا عن الرد إذ ليس لي عهدٌ بعلم الجغرافية ،لا سيما علوم الكوكب الأرضي ، وتقلُّباتِه وحركاتِه وما يَعتَريه من تغيُّرات وتجددات و ما ينحت هذه الصخور،فيحسُنُ بي أن لا أنبِسَ فيه بشيئ فضلا عن أن أُقنِعه بالحُجج والبراهين فيَقتَنِع بها ويَسكت، إذن ما يكونُ مني إلا أن ألُوذَ بالصمتِ وأَكِلَ العلمَ إلى العليمِ القديرِ جلَّ وعلا.

على رغم ذلك ،خلِّ العقلَ اليومَ يَخبِطْ خَبْطَ عشواءَ فما يُصبْ من الأسباب يُدْلِه، وما يُخيَّلْ إليه يُلْقِه. فمن البَدائهِ طبعاً أنه لا يَقطعُ لك بما يَهفُو، بل يستخدم القياساتِ والأفكارَ التى تطرأ عليه ببادئ الرأي. ياالله إذن نبدأ...!

أولا: ليس من المُستبعَد ولا المُستحيل أبدًا أنَّ اللهَ خَلقَ الصخورَ هكذا كما نُشاهد، مُتفرِّقةً و مُتشتِّتةً ومتراكمة و منتصبة على سافلها التافه ،وجعلها مُتفوِّقةً أي : بعضُها فوق بعض مستندًا إليه ومعتمدًا عليه، فالصخورُ إذن بما أنها مَبعثُ العجَبِ والحيرةِ من عجيبِ قدرةِ اللهِ عزَّ وجلَّ ،و من بديع صُنعِه سبحانه. وهي آيةٌ دالة على أن لها خالقًا خلقَها و وبديعًا ابتدَعَها، ولطمةٌ عنيفةٌ على ثغورِ أفراخ الإلحادِ المنكر وجودَ الله الخالق - تعالى الله علوا كبيرا- ، ودحضةٌ حاسمة لِكُثبَانِ دَلائلِهم. وهدمةٌ كاسحة لكُوخِ مُعتَمدِهم، وضربةٌ قاضية على أصلهم الواهي.

ثانيا: ومن الممكنِ وقوعًا أنه بإذن اللهِ تعالى تَزلزَلَتْ الأرضُ في الغابر مرةً بأهلها زلزالاً عنيفًا، فانكسَرتِ الْجبالُ صخرةً صخرةً.وصارتْ بعضُها فوقَ بعضٍ ،فهي منذُ ذلك الحينِ على حالِها الحاليةِ، أو تكررت عليها الزلازل فأصبحت كما نرى.

ثالثا: ومن المُفتَرَضاتِ أنَّ الإنسانَ جعلَها هكذا متراكمةً ومُسنَدَةً ،في زمنٍ من الأزمان في الماضي.

هذا ما عندي والله أعلم بالصواب..!

رابعا: أتركُ لك الفراغَ ،عبِّر ما يخطر ببالك.

خامسا : أيضا لك الخيارُ املأ بما تشاء 🤭

على أية حالة ،الصخور الهائلة القائمة على سافلها التافه على هيئة التراكم والتدحرج شيئ مدهش ومحير بالنسبة لي. وقد شاهدتها في أماكن كثيرة بالهند وبالمملكة حتى في رحاب جامعتنا هناك صخور على الحال المذكورة المدهشة، فكلَّ يوم نراها، وكما يقال: كثرةُ المِساس تُميتُ الإحساسَ أو كما يقال، مع ذلك كلما أدورُ بالبصرِ عليها تحيرني وتستوقفني مُندهشًا مُتسائلاً.

إن كان عندك معرفةٌ بسبب ذلك مُوثَّقةٌ يَصلُح التعريجُ عليها ويُمكن التعويلُ عليها، فشَارِكْنا فيها مشكورًا ومأجورًا.

خيرا .. إلى اللقاء...
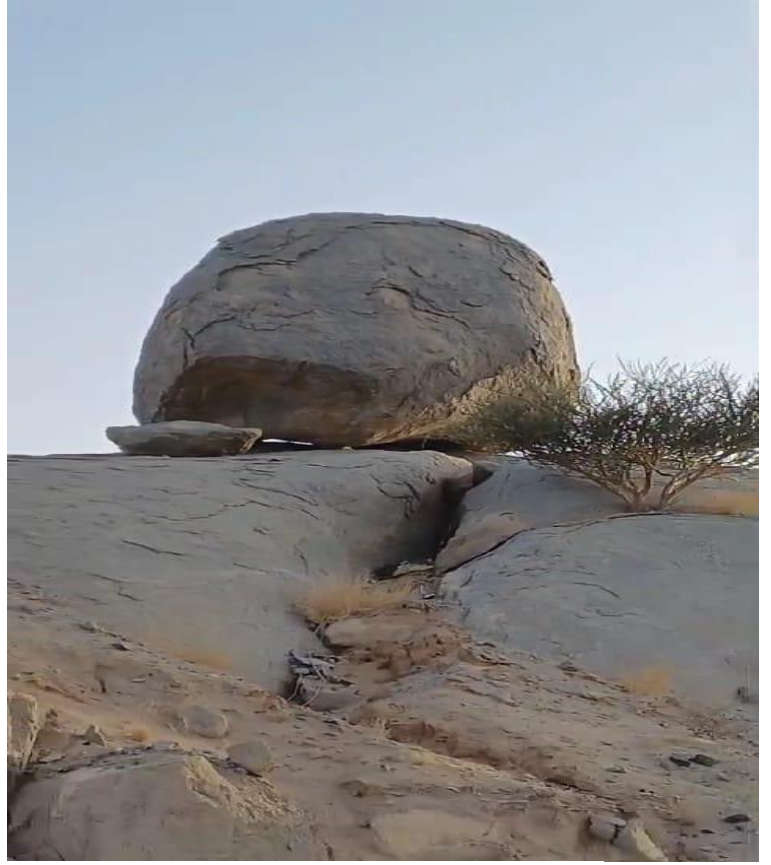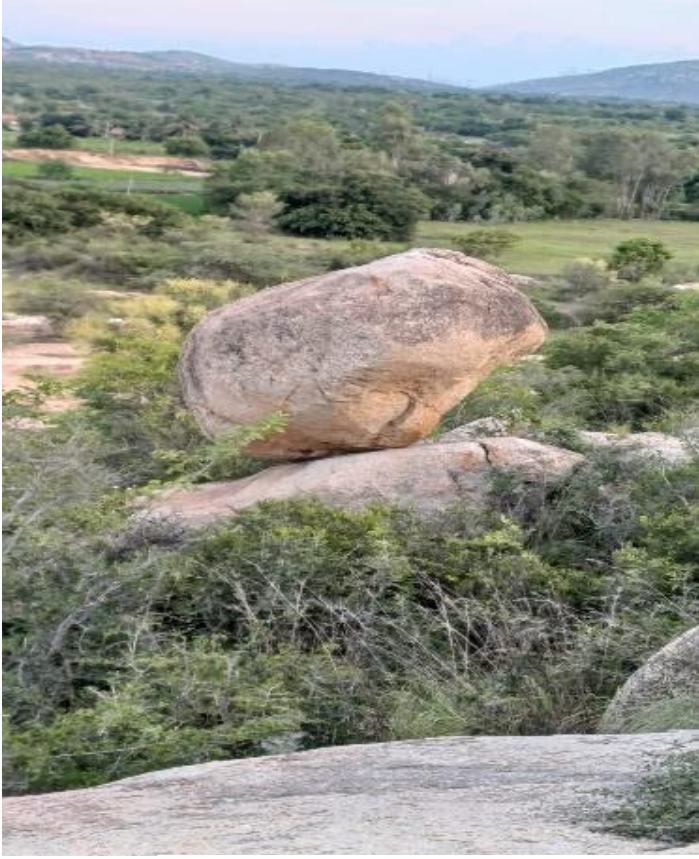
﴿وَلَوۡ أَرَادُواْ ٱلۡخُرُوجَ لَأَعَدُّواْ لَهُۥ عُدَّةً﴾

عبدالقادر بن مطيع الرحمن السلفي

بسم الله والحمدلله والصلاة والسلام على رسوله وعلى آله وصحبه ومن والاه، وبعد:

فسبحان الله..! نعمت الآية هذه.! وما أعظم ما أحاطت من الحقيقة.!! هزتني هزا ، تأمل فيها تأمل الرشيد وتدبرها تدبر الشهيد، تجدها مشتملة على قاعدة كلية في الحياة، وهي من السنن الإلهية التي يقوم عليها قانون الكون ونظام الشرع وهي ضابط مطرد أجراه الله بحكمته في قدره وشرعه ،ألا وهي ربط المسببات بأسبابها، أي : إذا أردت إنجاز عمل مثلا فخذ له أسبابا تؤديك إلى الظفر به. فالأخذ بالأسباب لا ينافي القدر ولا التوكل على الله جل وعلا البتة ،إذ التوكل عليه جلا وعلا حقيقة شرعية مأمور بها، ولا يكتمل الأخذ بها إلا بمراعاة الأسباب أخذا وعملا.

تكاثرت النصوص على هذا القانون تكاثرا يكل في إحصاءها البنان ويمل في عدها اللسان ، وهو يدل عليه الفطرة والعقل كذلك فلذا ترى البهائم تتخذ الأسباب. فلِكَي يزداد الغرض شرحا وإيضاحا أورد لكم من آي القرآن وتفسيرها ومن الأحاديث النبوية وشرحها ما يوضح المقصود أكمل توضيح وأتمه. فمنها : قوله تعالىٰ في أصحاب الكهف: ﴿وَنُقَلِّبُهُمۡ ذَاتَ ٱلۡيَمِينِ وَذَاتَ ٱلشِّمَالِۖ﴾ [الكهف : ١٨]

في تفسير الآية يقول السعدي رحمه الله : "وهذا أيضا من حفظه (الله عز وجل) لأبدانهم، لأن الأرض من طبيعتها أكل الأجسام المتصلة بها، فكان مِن قدر الله، أن قَلَّبهم على جنوبهم يمينا وشمالا، بقدر ما لا تفسد الأرض أجسامهم، والله تعالى قادر على حفظهم من الأرض، من غير تقليب، ولكنه تعالى حكيم، أراد أن تجري سنته في الكون، ويربط الأسباب بمسبباتها. " [تفسير السعدي: ص ٤٩٦]

أيها القاريء الكريم ! تدبر هذه الآية الكريمة أيضا ﴿فَإِذَا قُضِيَتِ ٱلصَّلَوٰةُ فَٱنتَشِرُواْ فِي ٱلۡأَرۡضِ وَٱبۡتَغُواْ مِن فَضۡلِ ٱللَّهِ وَٱذۡكُرُواْ ٱللَّهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُونَ﴾ [الجمعة : ١٠]

ثم هذا الحديث النبوي كذلك " لو أنكم كنتم توكلون على الله حق توكله لرزقتم كما يرزق الطير، تغدو خماصا وتروح بطانا"

أخرجه الترمذي واللفظ له: 2344، وابن ماجة : 4164، وأحمد : 205. وصححه الألباني.

قد حث الشارع الحكيم على اتخاذ الأسباب كما هو ظاهر معنى الآية وقد أكد النبي الكريم عليه الصلاة والسلام على حسن التوكل على الله في ابتغاء الرزق، ومن ثم يبدو ببادئ النظر قليل من التعارض بينهما إذ أمر الله بالانتشار في الأرض ابتغاء الرزق وهو السبب طبعا،وفي الحديث، يركز النبي الكريم عليه الصلاة والسلام على حسن التوكل، لكن الأمر ليس كذلك في الحقيقة،بل كل ما يكون هو أن السر يكمن في كلمة " تغدو خماصا وتروح بطانا" حيث يتجلى المعنى من خلال الجمع بين التوكل على الله وبين السعي بالرواح والغدو، ولاجرم هو اتخاذ السبب، فكما أن التوكل سبب شرعي لنيل الرزق، فكذلك الغدو والرواح سبب مادي للحصول عليه أيضا.

ومن الحديث ما يستوفي هذا المعنى أكمل الوفاء : ﴿اعْقِلْها و توكَّل﴾ قاله الرسول الكريم لصاحب الإبل عندما سأله: يا رسول الله أعقلها وأتوكل أو أطلقها وأتوكل؟

[صحيح الترمذي :٢٥١٧ وحسنه الألباني (صحيح الجامع برقم ١٠٦٨)]

يحسن بي هنا أن أورد لك أثرا مشهورا عن عمر رضي الله عنه حيث قال حين امتناعه عن دخول الشام ،وكان بها الطاعون متفشيا : " نَفرُّ من قدَر الله إلى قدَرِ الله " وهو اتخاذ السبب مع التوكل على الله

[صحيح البخاري :٥٧٢٩،صحيح مسلم :٢٢١٩]

أيها النجيب.! لَمَّا قد عرضنا فيما مضى النصوص الشرعية على موضوعنا ربط الأسباب بمسبباتها، ينبغي لنا في هذا المقام ذكر بعض الأقوال لثلة من علماء السلف، وذلك بأن السلف - كما هو معروف- أعلم وعلمهم أحكم و أسلم .

قال ابن تيمية رحمه الله[ت٧٢٨هـ]: "فالالتفات إلى الأسباب شرك في التوحيد، ومَحْو الأسباب أن تكون أسبابا نَقْصٌ في العقل، والإعراض عن الأسباب بالكلية قدْحٌ في الشرع" [مجموع الفتاوى : ٨/ ٧٠]

أي : شرك أن يَمحَض العبدُ الاتكالَ على الأسباب دون صدق اللجوء إلى الله عز وجل وحسن التوكل عليه، لأنه أشرك بالله غيره (أي: الأسباب) في الملك والتدبير والنفع والضر. أما إنكار حقيقة الأسباب وأثرها في المسببات فهو قدح وعيب وثلب في الشريعة،لأنها أقرت بذلك.

وقال ابن القيم (ت ٧٥١هـ) رحمه الله:

"وَفِي الْأَحَادِيثِ الصَّحِيحَةِ الْأَمْرُ بِالتَّدَاوِي وَأَنَّهُ لَا يُنَافِي التَّوَكُّلَ، كَمَا لَا يُنَافِيهِ دَفْعُ دَاءِ الْجُوْعِ وَالْعَطَشِ، وَالْحَرِّ، وَالْبَرْدِ بِأَضْدَادِهَا، بَلْ لَا تَتِمُّ حَقِيقَةُ التَّوْحِيدِ إِلَّا بِمُبَاشَرَةِ الْأَسْبَابِ الَّتِي نَصَبَهَا اللهُ مُقْتَضَيَاتٍ لِمُسَبَّبَاتِهَا قَدَرًا وَشَرْعًا، وَأَنَّ تَعْطِيلَهَا يَقْدَحُ فِي نَفْسِ التَّوَكُّلِ، كَمَا يَقْدَحُ فِي الْأَمْرِ وَالْحِكْمَةِ وَيُضْعِفُهُ مِنْ حَيْثُ يَظُنُّ مُعَطِّلُهَا أَنَّ تَرْكَهَا أَقْوَى فِي التَّوَكُّلِ، فَإِنَّ تَرْكَهَا عَجْزٌ يُنَافِي التَّوَكُّلَ الَّذِي حَقِيقَتُهُ اعْتِمَادُ الْقَلْبِ عَلَى اللهِ فِي حُصُولِ مَا يَنْفَعُ الْعَبْدَ فِي دِينِهِ وَدُنْيَاهُ، وَدَفْعِ مَا يَضُرُّهُ فِي دِينِهِ وَدُنْيَاهُ، وَلَا بُدَّ مَعَ هَذَا الِاعْتِمَادِ مِنْ مُبَاشَرَةِ الْأَسْبَابِ وَإِلَّا كَانَ مُعَطِّلًا لِلْحِكْمَةِ وَالشَّرْعِ فَلَا يَجْعَلُ الْعَبْدُ عَجْزَهُ تَوَكُّلًا وَلَا تَوَكُّلَهُ عَجْزًا."

[زاد المعاد في هدي خير العباد : ٤/ ١٤ - ط الرسالة]

وقال ابن حجر (ت ٨٥٢هـ) في الفتح: المراد بالتوكل : اعتقاد ما دلت عليه هذه الآية: وما من دابة في الأرض إلا على الله رزقها .وليس المراد به : ترك التسبب والاعتماد على ما يأتي من المخلوقين، لأن ذلك قد يجر إلى ضد ما يراه من التوكل، وقد سئل أحمد عن رجل جلس في بيته، أو في المسجد وقال: لا أعمل شيئا حتى يأتيني رزقي، فقال: هذا رجل جهل العلم، فقد قال النبي صلى الله عليه وسلم: إن الله جعل رزقي تحت ظل رمحي، وقال: لو توكلتم على الله حق توكله لرزقكم كما يرزق الطير تغدو خماصا وتروح بطانا .فذكر أنها تغدو وتروح في طلب الرزق، قال: وكان الصحابة يتجرون ويعملون في نخيلهم والقدوة بهم.

[فتح الباري : ١١/ ٣٠٥ ،ط دار المعرفة - بيروت، ١٣٧٩]

أكتفي بما سبق من الأقوال وفيها غنية وكفاية،وإلا الأمر كمَثل " حدث عن البحر ولا حرج"

أخي في الله ! هناك ضوابط مهمة يتأكد التفطن لها في هذا المقام. منها:

أولا : أن الأخذ بالأسباب مختلف مرتبة وحكما، فهو يختلف باختلاف المسبب المطلوب إيجاده، فقد يكون الأخذ بالأسباب واجبا، وذلك إذا كان فعله لتحصيل واجب، وقد يكون الأخذ بالأسباب حراما، وذلك إذا كان السبب المطلوب فعله يؤدي إلى حرام، وهكذا في المستحبات والمكروهات، بناء على القاعدة الفقهية: "الوسائل لها حكم المقاصد"

ثانيا : لا يلزم من وجود الأسباب وجود المسببات فالأمر فيها ليس كالمثل ١+١ = ٢، فقد يوجد مانع يمنع من حصول المسبب، فالنار تحرق ولكنها لم تحرق إبراهيم عليه السلام معجزة منه سبحانه لنبيه إبراهيم عليه السلام، كما قال ابن القيم في الدعاء وهو من أقوى الأسباب لحصول المطلوب ودفع المكروه. : " وَالْأَدْعِيَةُ وَالتَّعَوُّذَاتُ بِمَنْزِلَةِ السِّلَاحِ، وَالسِّلَاحُ بِضَارِبِهِ، لَا بِحَدِّهِ فَقَطْ، فَمَتَى كَانَ السِّلَاحُ سِلَاحًا تَامًّا لَا آفَةَ بِهِ، وَالسَّاعِدُ سَاعِدُ قَوِيٍّ، وَالْمَانِعُ مَفْقُودٌ؛ حَصَلَتْ بِهِ النِّكَايَةُ فِي الْعَدُوِّ، وَمَتَى تَخَلَّفَ وَاحِدٌ مِنْ هَذِهِ الثَّلَاثَةِ تَخَلَّفَ التَّأْثِيرُ، فَإِنْ كَانَ الدُّعَاءُ فِي نَفْسِهِ غَيْرَ صَالِحٍ، أَوِ الدَّاعِي لَمْ يَجْمَعْ بَيْنَ قَلْبِهِ وَلِسَانِهِ فِي الدُّعَاءِ، أَوْ كَانَ ثَمَّ مَانِعٌ مِنَ الْإِجَابَةِ، لَمْ يَحْصُلِ الْأَثَرُ"

[الداء والدواء : ص ٢٢ ،ط دار اليقين ،مصر]

فلا بد إذن من أن يكون السبب مناسبا صالحا أخذه ،وآخِذُه قويا مؤثرا، والمانع من تأثيره مفقودا.

قولنا بأخذ الأسباب وتأثيرها في المسببات يتحلى بالوسطية و يتميز بالاعتدال كوصفنا في كافة الشريعة الغراء خلافا لأهل الإفراط والتفريط، فالحمد لله الذي هدانا لهذا وما كنا لنهتدي لو لا أن هدانا الله. إذن نحن نبثت للأسباب تأثيرا في مسبباتها كما أثبت الله لكن لا بذاتها ،بل بما أودعه الله تعالى فيها من القوى الموجِبة، فكل من السبب والمسبَّب تحت المسبِّب الملك المقتدر القهار جلا وعلا. وهو مسبِّب الأسباب مع أنه لاحاجةَ له إلى سببٍ لحصول المسبَّب، لكن هو القدير الحكيم أجرى سنته في الكون بربط الأسباب بمسبباتها.

أيها اللبيب.! أخيرا أقول خلاصة للمقال أن التوكل على الله والأخذ بالأسباب هما كالجَناحَين للمؤمن يطير بهما إلى أرض الفوز والفلاح، فهل يستطيع طائر على الطير بِجَناح واحد؟! حاشا وكلا..! ولا يعزب عن خاطرك أن كل من السبب والمسبَّب تحت مشيئة المسبِّب القدير القهار عز شأنه، فهو قادر على أن يفطر المسبَّب دون أي سبب كعيسى عليه السلام خلق ولم يمسس بشر أمها مريم البتول عليها السلام، وكما هو قادر على تعطيل أثر السبب في المسبَّب حيث صيَّر النار المحرق بردا وسلاما على إبراهيم عليه السلام، ولم تنل منه شيئا. إذن أدركت أنك إن أردت لك مستقبلا زاهرا ، ودورا مشرقا، و حياة حافلة بالعطاء والإنجازات ونَفعِ العباد والبلاد وتبتغي بذلك العقبى في الآخرة ، فعليك كطالب العلم إعداد العدة المناسبة لذلك ألا وهي عبارة عن الجد والمثابرة في طلب العلم واستنفادِ الوُسع وبذلِ المُهَج وكل نفيس وغال ،مع حسن التوكل على الله، والإلحاح على الدعاء لك بالعلم النافع،لان العلم نور يقذف الله فى قلب من يشاء وهو العلم نور يجلو العمى عن قلب صاحبه وفيه لذة وطعمه شهيّ .قال الالبيري(ت ٤٦٠ ه) :

فلَوْ قد ذُقتَ مِن حَلواه طَعماً   لآثرتَ التعلُّمَ واجتَهدتَا

فإعداد العدة من الأخذ بالأسباب، وهو مأمور به في الشرع وكمال في العقل، لكن حذار حذار أن تتكل على أخذك بالأسباب فقط و تنشغل بها عن الله وحسن التوكل عليه و كثرة دعاءه للفوز وصدق اللجوء إليه عز وجل . بل اجمع بينهما أحسن الجمع وأعدله.

في الحقيقة الكلام ذو شجون ،وأنتم أولوا النهى والحجر ،فأكتفي بهذا.

أسأل الله العظيم التوفيق السداد لكل ما يحبه ويرضاه، آمين

The Month of Ramadan has ended.

Mohammed Zeeshan Al-Falahi.

Ramadan came and passed very quickly.

And now a question in our creative minds rises what's now! The month of Ramadan has ended!

Allah said in Surah Fussilat: 30

إن الذين قالوا ربنا الله ثم استقاموا تتنزل عليهم الملائكة

Indeed those who said our Lord is Allah and remained steadfast upon them the angels descends.

We have come to realise, the thing we are ordered to do is Remaining ourselves Steadfast.

And now the holy month has ended so are we going to come to our old tracks?

Throughout the Ramadan, we have strived and tried to be the best version of ourselves islamically. We were praying salah on time without missing any, we were reciting the holy Quran on a daily basis, we were good to our parents, wives, children, relatives, neighbours and each and everyone we met, we were not false in ours talks, we were tried to call people towards good and stopped them from doing bad, we were true every

single moment of this month and we never felt the need of falsehood! Etc.

But suddenly what happens after the 1st of shawwal? We slowly get back on the track on which we were before.

The Holy month Ramadan came as a blessing to us and taught us how we should be and then all of a sudden, we forget every single thing.

O who u believed in Allah and the last day, come on hold the rope of Allah firmly don't be clumsy, indeed the Holy month has ended but still we are Muslims, still we are obliged for our prayers, still we have to be good to every single person we meet, still we are obliged to call people towards good and stop them from bad. The thing we are obliged to do is with us until our last breath.

The Prophet Muhammad صلی اللہ علیہ وسلم said to fast the 6 days of shawwal just after the Ramadan ends he said:

(من صام رمضان وأتبعه ستا من شوال فذلك صيام الدهر) رواه مسلم

The one who fasts the month of Ramadan and then fasts 6 days of Shawwal it is like fasting for a Whole year.

The Prophet Muhammad صلی للہ علیہ وسلم said:

(إن أحب الأعمال إلى الله ما دووم عليه وإن قل) رواه مسلم

The best acts of worship which are beloved to Allah is those which are done regularly even if it is small.

We got to know that, Suddenly after Ramadan another thing is being ordered (i.e. Fasting 6 days in Shawwal) and after that the preparation for Hajj starts, so the obligations don't end by ending of the months. The thing we have to do is to get more motivated when these months arrives and try to work on ourselves where we lack and try to remain steadfast on what we learn.

وما توفيقي إلا بالله

হারাম-হালাল নির্ধারণে বিজ্ঞানকে মানদণ্ড হিসেবে নেওয়া

মোঃ মইনুল হাসান

(শিক্ষার্থী নাজরান বিশ্ববিদ্যালয় সৌদি আরব)

অনেক মানুষ দেখা যায়, যারা ইসলামের হারাম ও হালাল বিষয়ের ক্ষেত্রে বিজ্ঞানের উপর নির্ভর করে সিদ্ধান্ত গ্রহণের চেষ্টা করে। তারা মনে করে, কোনো বিষয়ের বৈজ্ঞানিক ক্ষতি থাকলে সেটি হারাম, আর যদি কোনো ক্ষতি না থাকে তবে সেটি হালাল। কিন্তু প্রশ্ন হলো, ইসলামের বিধিবিধানকে বিজ্ঞান দিয়ে যাচাই করা কতটুকু শরিয়তসম্মত?

বিজ্ঞান পরিবর্তনশীল, কিন্তু শরিয়াহ চিরন্তন

বিজ্ঞান একটি পরিবর্তনশীল জ্ঞান। আজ যা সত্য বলে প্রতিষ্ঠিত, ভবিষ্যতে সেটিই ভুল প্রমাণিত হতে পারে। যেমন, এক সময় ধারণা ছিল রকেট মহাকাশে গেলে আর ফিরে আসবে না। কিন্তু আধুনিক বিজ্ঞানী ইলন মাস্ক নতুন প্রযুক্তি আবিষ্কার করে দেখিয়েছেন যে রকেট শুধু মহাকাশে যাবে না, বরং আবার পৃথিবীতে ফিরে আসতে পারবে।

এভাবে বিজ্ঞানের অনেক সিদ্ধান্ত সময়ের সাথে পাল্টে যায়। কিন্তু ইসলামের বিধান অপরিবর্তনীয় ও চূড়ান্ত। আল্লাহ যা হারাম করেছেন, তা বিজ্ঞান যাই বলুক না কেন, সব সময়ই হারাম থাকবে।

হারাম-হালালের বিষয়ে বিজ্ঞানের ওপর নির্ভর করলে বিভ্রান্তি তৈরি হবে

যদি কেউ বিজ্ঞানের ভিত্তিতে হারাম-হালাল নির্ধারণ করতে চায়, তাহলে অনেক ইসলামি বিধান মেনে চলা কঠিন হয়ে যাবে।

উদাহরণস্বরূপ, ঋতুবতী স্ত্রীর সাথে সহবাস করা ইসলামে স্পষ্টভাবে হারাম। কিন্তু বর্তমানে কিছু ডক্টর বলেন, যদি সঠিক প্রটেকশন ব্যবহার করা হয়, তাহলে কোনো সমস্যা নেই। এখন প্রশ্ন হলো, বিজ্ঞান যেহেতু একথা বলছে, তাহলে কি আমরা এটি বৈধ মনে করব?

না, কারণ ইসলামে এটি সুস্পষ্টভাবে হারাম বলে নির্ধারিত হয়েছে। আমরা জানি, বিজ্ঞান তার সিদ্ধান্ত পরিবর্তন করতে পারে, কিন্তু আল্লাহর বিধান পরিবর্তন হয় না।

বিজ্ঞানের ভিত্তিতে হস্তমৈথুন বৈধ করার চেষ্টা

আজকাল কিছু সাধারণ শিক্ষিত ব্যক্তি বৈজ্ঞানিক যুক্তি দিয়ে হস্তমৈথুনকে হালাল প্রমাণ করার চেষ্টা করে। তারা বলে, "এতে কোনো ক্ষতি নেই, তাই এটি বৈধ হওয়া উচিত।" অথচ আল্লাহ স্পষ্টভাবে কুরআনে বলেছেন:

{وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ (5) إِلَّا عَلَى أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ(6)}

"এবং যারা নিজেদের গোপনাঙ্গের হেফাজত করে [৫] শুধুমাত্র তাদের স্ত্রীদের বা তাদের দাসীদের (যাদের তারা মালিক) ব্যতীত।"

— (সুরা আল-মু'মিনুন: ৫-৬)

ইমাম শাফেয়ী (রহ.) "কিতাব আন-নিকাহ" গ্রন্থে লিখেছেন:

"যখন মুমিনদের বৈশিষ্ট্য এইভাবে বর্ণনা করা হয়েছে যে তারা নিজেদের গোপনাঙ্গ কেবল তাদের স্ত্রীদের ও দাসীদের সাথে ব্যবহার করে, তখন এটা স্পষ্ট যে, এর বাইরে অন্য কোনো ক্ষেত্রে গোপনাঙ্গ ব্যবহার করা হারাম। এরপর আল্লাহ সুবহানাহু ওয়া তা'আলা এই বিষয়টিকে আরও জোর দিয়ে বলেছেন:

{فَمَنِ ابْتَغَى وَرَاءَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ}

'যে ব্যক্তি এর বাইরে কিছু অন্বেষণ করবে, তারাই সীমালঙ্ঘনকারী।'

—(সুরা আল-মু'মিনুন: ৭)

এজন্য শরিয়তের দৃষ্টিতে হস্তমৈথুন স্পষ্টভাবে হারাম।

আরেকটি কুরআনি দলিল:

আল্লাহ আরও বলেন:

{وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا حَتَّىٰ يُغْنِيَهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ}

"যারা বিয়ে করার সামর্থ্য রাখে না, তারা যেন সংযম অবলম্বন করে, যতক্ষণ না আল্লাহ নিজ অনুগ্রহে তাদের অভাবমুক্ত করেন।"

—(সুরা আন-নূর: ৩৩)

এখানে "সংযম অবলম্বন করা" অর্থ বিয়ের বাইরে সমস্ত ধরনের যৌনসুখ থেকে বিরত থাকা।

হাদিসের আলোকে হস্তমৈথুন হারাম হওয়ার প্রমাণ

হজরত আবদুল্লাহ ইবনে মাসউদ (রাযি.) বলেন:

"আমরা নবী সাল্লাল্লাহু আলাইহি ওয়াসাল্লামের সাথে তরুণ অবস্থায় ছিলাম এবং আমাদের কিছুই ছিল না। তখন রাসুল (সা.) বললেন: হে যুবক দল! তোমাদের মধ্যে যে ব্যক্তি বিয়ের সামর্থ্য রাখে, সে যেন বিয়ে করে। কারণ, এটি দৃষ্টি অবনত রাখে এবং লজ্জাস্থানের হেফাজত করে। আর যার সামর্থ্য নেই, সে যেন রোযা রাখে। কারণ, রোযা তার জন্য ঢালস্বরূপ হবে (যেন হারামে পড়তে না পারে)।"

—(সহিহ বুখারি: ৫০৬৬)

এখানে নবী (সা.) রোযা রাখার নির্দেশ দিয়েছেন, কিন্তু হস্তমৈথুনের অনুমতি দেননি। অথচ আত্মতৃপ্তি রোযার তুলনায় সহজ সমাধান ছিল। যদি এটি বৈধ হতো, তাহলে রাসুল (সা.) এটি করার পরামর্শ দিতেন। কিন্তু তিনি তা বলেননি, বরং কঠিন হলেও রোযার নির্দেশ দিয়েছেন।

বিজ্ঞান কখনো হারাম-হালালের মানদণ্ড হতে পারে না। ইসলামের বিধান চূড়ান্ত ও অপরিবর্তনীয়, কিন্তু বিজ্ঞান পরিবর্তনশীল। যারা বিজ্ঞানের যুক্তি দিয়ে ইসলামের হারাম বিষয়কে হালাল করার চেষ্টা করে, তারা ভুল পথে আছে। মুসলমানদের উচিত, বিজ্ঞান যাই বলুক না কেন, শুধু কুরআন ও সুন্নাহকেই চূড়ান্ত সত্য হিসেবে গ্রহণ করা।

اللهم أرنا الحق حقاً وارزقنا اتباعه وأرنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابه

(হে আল্লাহ! আমাদের সত্যকে সত্য হিসেবে দেখিয়ে দিন এবং তা অনুসরণ করার তৌফিক দিন। আর আমাদের মিথ্যাকে মিথ্যা হিসেবে দেখিয়ে দিন এবং তা থেকে বেঁচে থাকার তৌফিক দিন)। আমিন!

غزل

اسدامواوی

آج پھر آیا ہے کیوں آنکھ دکھانے کے لیے
در و آلام ہمارا یوں بڑھانے کے لیے

آنکھ سے اشک نہیں خون ہوا ہے جاری
اشک آنکھوں میں بچا ہی نہ بہانے کے لیے

کب تلک سہتے رہیں ظلم و تشدد آخر
اب اٹھیں اینٹ سے ہم اینٹ بجانے کے لیے

لعل جس باپ نے کھویا ہے اسی سے پوچھو
پڑھنے بھیجا تھا نہ کہ جان گنوانے کے لیے

سر جھکانے کا ہنر ہم نے نہیں سیکھا ہے
ہم تو تیار ہیں سر اپنا کٹانے کے لیے

کفر گر مد مقابل ہو تو ڈرنا کیسا
تین سو تیرہ ہی کافی ہے ہرانے کے لیے

ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے نہیں ہیں سن لو
عزم رکھتے ہیں دل و جان لٹانے کے لیے

زندہ تاریخ مٹانے پہ تلے ہیں اعداء
ہم ہیں زندہ انہیں تاریخ پڑھانے کے لیے

اپنے پرکھوں کی نشانی کو مٹائیں کیسے
یہ ہیں نادان جو آئے ہیں مٹانے کے لیے

جان دے دیں گے مگر ہم نہیں جانے والے
بے سبب جہد مسلسل ہے بھگانے کے لیے

زخم پر زخم دئے اور نمک پاشی بھی
اور بل پاس کیا کرب بڑھانے کے لیے

پھر ابابیل پرندوں سے مدد کر مولا
ابرہہ نکلا ہے مسجد کو گرانے کے لیے

نازلہ پڑھ کے ہلاکت کی دعا مانگ اسد
کہ بچے ایک بھی ظالم نہ ستانے کے لیے